قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1966

سچے موتی

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا۔ یا ان کے ہاں بال بچوں پر ویسے ہی فاقے کی نوبت آجاتی۔ تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لیتے۔ اور پھر اس کے برابر حصے کر کے آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

(صحیحین)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

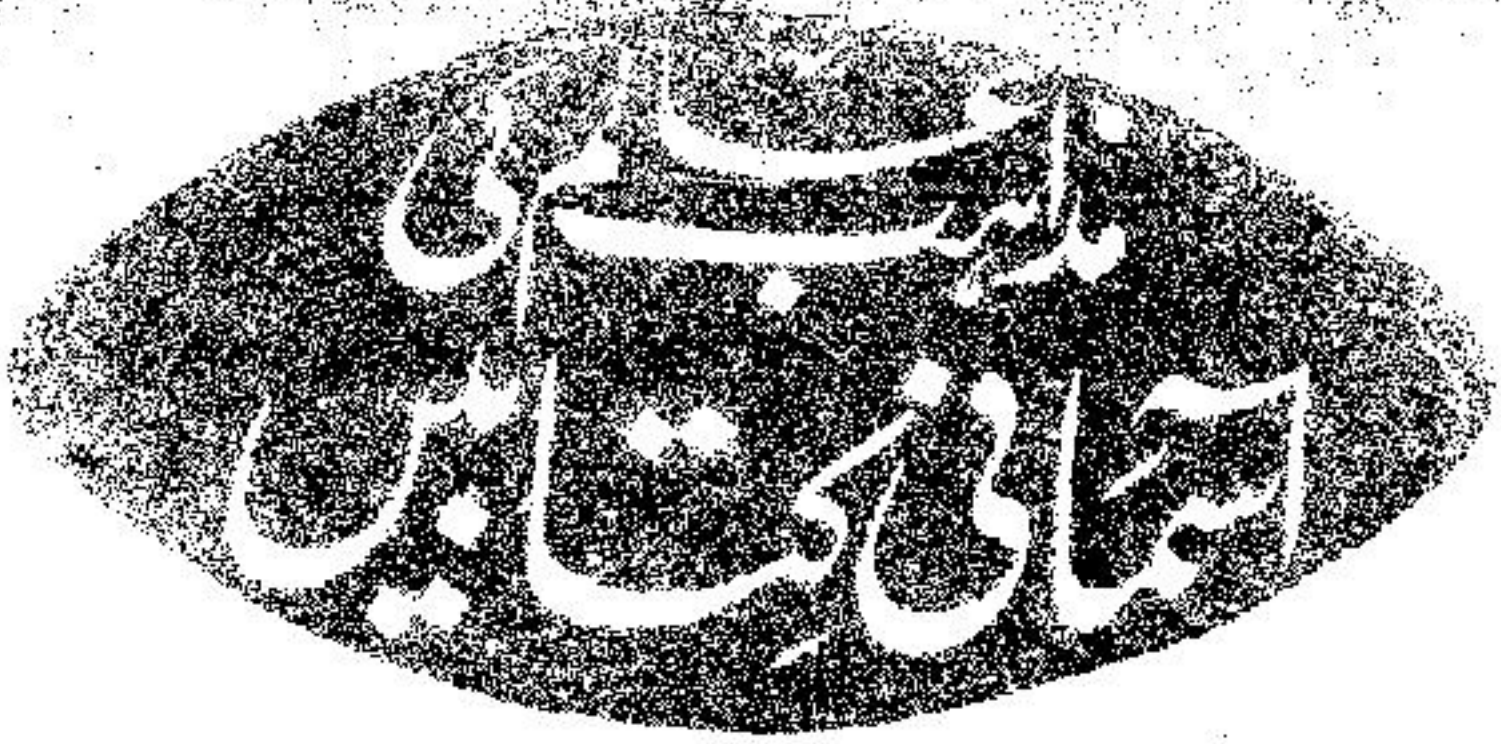

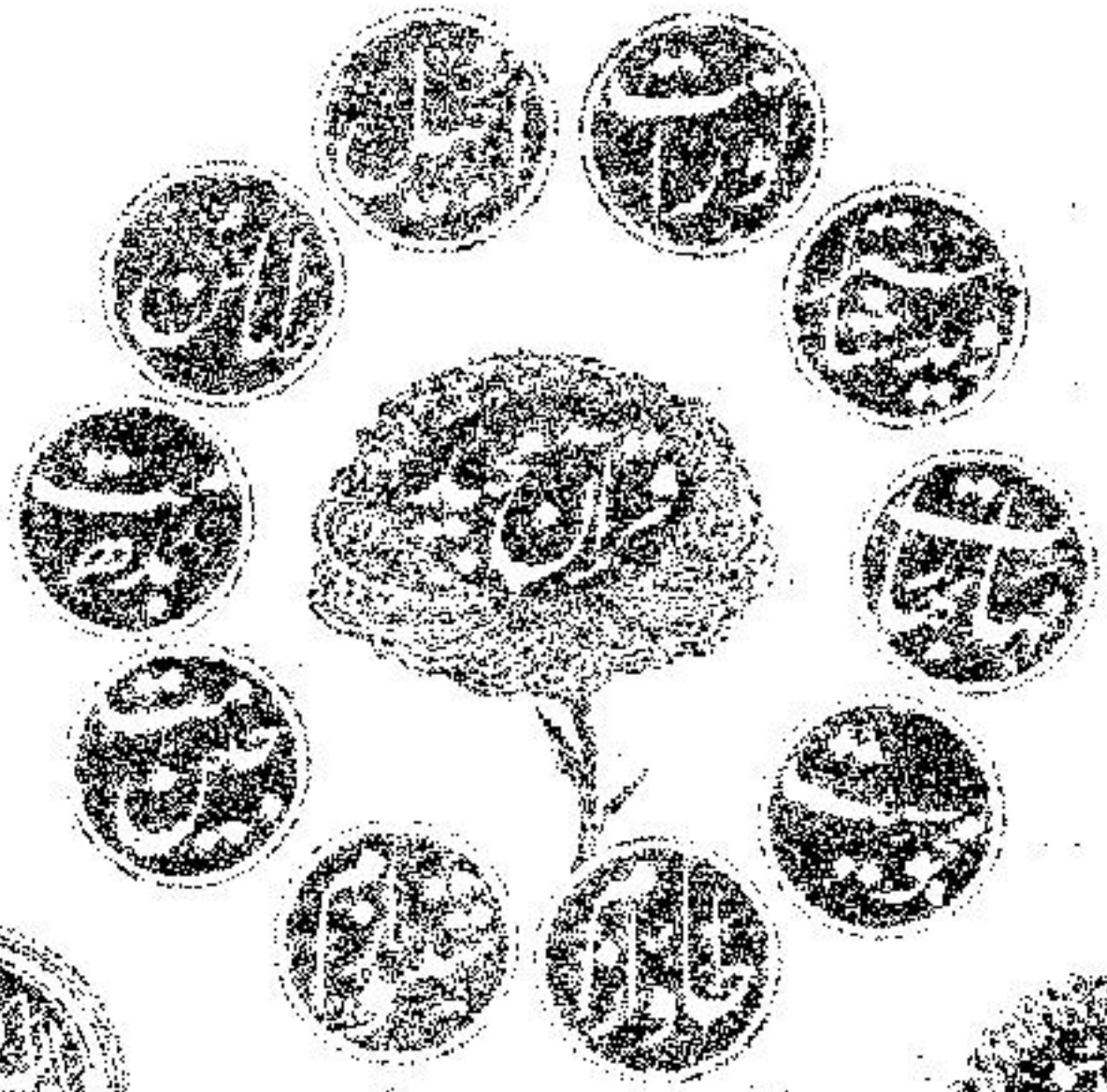

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

سالانہ ــــ پاکستان ــــ دس روپے

سالانہ ــــ ہندوستان ــــ پندرہ روپے

سالانہ ــــ غیر ممالک سے ــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

ہندوستان	پاکستان
ڈیڑھ روپیہ	ایک روپیہ

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت کا پتہ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵ - بی گلبرگ ۲ - لاہور

جلد ۱۹ — **نومبر ۱۹۶۶ء** — نمبر ۱۱

فہرستِ مضامین

۱۔ لمعات ــــ ۲

۲۔ طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد ــــ ۱۳

۳۔ دین کی باتیں (محترمہ ثریا عندلیب) ــــ ۱۴

۴۔ نقد و نظر ــــ ۱۵

۵۔ ظلم کا انجام (محترم پرویز صاحب) ــــ ۱۷

۶۔ پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے ــــ ۴۱

۷۔ باب المراسلات ــــ ۵۷

۸۔ بھارت کا عالمی کردار (محترم خورشید عالم صاحب) ــــ ۶۵

۹۔ حقائق و عبر ــــ ۷۳

۱۰۔ رابطہ باہمی ــــ ۷۸-۸۰

ایڈیٹر صفدر سلیمی ناشر سراج الحق مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ لاہور [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(۱)

از غلامی دل بمیرد در بدن

غلامی اور آزادی میں یہی فرق نہیں ہوتا کہ غلامی میں حکومت کسی غیر قوم یا غیر ممالک کے باشندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور آزادی میں زمامِ اقتدار اپنی قوم کے افراد کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ محض افراد کی تبدیلی سے غلامی، آزادی نہیں بن جاتی۔ آزادی سے قوم کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے جو غلامی میں ممکن نہیں ہوتی۔ اس تبدیلی سے قوم کی ذہنی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ اسکے قلب و نظر میں ایک خوشگوار انقلاب واقع ہو جاتا ہے۔ اس کی اقدار کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ اس کی زندگی کے مقاصد بدل جاتے ہیں۔ اس کا مطمحِ نگاہ بدل جاتا ہے۔ اس کا نصب العینِ حیات بدل جاتا ہے۔ یوں کہیئے کہ اس قوم کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ وہ قوم اور سے کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اُس کی اِس تبدیلی کے مظاہر سے اس کی زندگی کے ہر شعبے میں محسوس طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ اس کی عملی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ اس کے ذوقِ حسن و زیبائی میں ــــ کہ جسے عام طور پر کلچر سے تعبیر کیا جاتا ہے ــــ پاکیزگی اور نفاست پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے انداز و اطوار میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی رفتار و گفتار میں شائستگی آجاتی ہے۔ اس کی فکر میں سنجیدگی اور عمل میں توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی انسانی صلاحیتوں میں بالیدگی سے، اس کی سیرت میں پختگی اور کردار میں بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں سہار اور برداشت کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس کے مزاج میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی اقدار کے پیمانے بدل جانے سے، نفع اور نقصان کا معیار بدل جاتا ہے۔ اور اگر یہ اقدار، وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار ہیں، تو اس کے معاملات میں ــــ خواہ وہ افراد کے باہمی معاملات ہوں اور خواہ دیگر اقوام کے ساتھ معاملات، ان میں ــــ دیانت اور امانت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یوں

اس قوم کی زندگی اس دنیا میں بھی جنت بداماں ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی فردوس بدوش۔

غلامی اور آزادی میں یہی فرق ہے۔ اگر کسی قوم میں اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی تو وہ غلام کی غلام ہے، خواہ اقتدار اس کے اپنے ہاتھوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ آزاد قوم کے ارباب حل و عقد کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قوم کی ذہنی سطح کو بلند کریں اور اس کی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے سامان و ذرائع بہم پہنچائیں۔ جب قرآن کریم نے کہا تھا کہ رسول کا فریضہ یہ ہے کہ۔ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۔ وَ يُزَكِّيْهِمْ ۔ وہ انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا، اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے تو اس سے قوم میں اسی قسم کی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اور پھر اس ٹکڑہ کے اضافہ سے کہ ۔۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔۔۔ وہ قوم اس سے پہلے غلط راستوں پر چل رہی تھی ۔۔۔ غلامی اور آزادی کے اسی بنیادی فرق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ رسول آتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ قوم، زندگی کے ہر شعبہ میں، غلامی کی اندوہناک پستیوں میں گر چکی ہے ۔۔۔ اس حقیقت کو فراموش نہ ہونے دیجئے، کہ "غلامی" سے مراد یہ نہیں کہ اس قوم پر بالضرور کوئی دوسری قوم حکمران تھی۔ اس سے مراد غلامانہ ذہنیت ہے ۔۔۔ وہ دیکھتا ہے کہ غلامانہ ذہنیت قوم کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے، اس کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ وہ غلامی کی ان زنجیروں کو توڑ کر، قوم میں حریتِ فکر و نظر پیدا کرے۔ جن عناصر کا مفاد اسی میں مضمر ہوتا ہے کہ قوم غلامانہ ذہنیت میں ڈوبی رہے وہ اس داعیٔ انقلاب کے پیغام کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ بد قسمتی سے، غلامانہ ذہنیت سے انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اس لئے خود وہ قوم بھی اس پیغام کی مخالفت میں کچھ کم شدت نہیں برتتی۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ ان مخالفتوں پر قابو پا کر ایسا معاشرہ قائم کر لیتا ہے جس میں وہ "تعلیم کتاب وحکمت" کا فریضہ ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ "تعلیم کتاب" کے معنے یہ ہیں کہ وہ انہیں زندگی کے غیر متبدل قوانین اور مستقل اقدارِ حیات سے روشناس کراتے۔ اور "تعلیم حکمت" سے مفہوم یہ ہے کہ وہ انہیں عقل و فکر اور علم و بصیرت کی بنا پر سمجھائے کہ ان قوانین کی غرض و غایت کیا ہے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کے خوشگوار نتائج کیا ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی وہ معاشرہ میں انتظام کرتا ہے کہ افرادِ معاشرہ کی انسانی صلاحیتیں نشوونما پاتی چلی جائیں (اسے قرآن کی اصطلاح میں تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے)۔ اس طرح وہ رفتہ رفتہ قوم کی ذہنی اور انسانی سطح کو بلند کرتا چلا جاتا ہے۔ اس سعی و کاوش اور جہدِ مسلسل میں، اس کے راستے میں سب سے بڑا

سنگِ گراں، تقلید کا نظریہ (یا عقیدہ) ہوتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ تقلید سے مفہوم کیا ہے اور وہ کیوں انسانیت کی راہ میں سب سے بڑا پتھر ہے۔ تقلید سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی موجودہ ذہنی اور انسانی سطح پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے، اور اس جمود کو ایسا مقدس سمجھے کہ اسے چھوڑنا تو ایک طرف، اسے چھونے تک کے تصور سے اس پر کپکپی طاری ہو جائے۔ لیکن وہ داعیٔ انقلاب اس حقیقت سے باخبر ہوتا ہے کہ اگر ان کی ذہنی اور انسانی سطح وہی رہی، تو وہ قوم غلام کی غلام ہی رہے گی خواہ اُسے کتنی ہی وسیع و عریض مملکت کیوں نہ حاصل ہو جائے۔ اور اس پر رزق کے دروازے چاروں طرف سے کیوں نہ کھل جائیں۔ یہ ہیں وہ برفانی سلیں، جنہیں وہ ذہنِ انسانی سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اور یہ ہیں وہ مقدس زنجیریں جنہیں توڑ کر وہ شہپرِ انسانیت کو آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی دینا چاہتا ہے۔ جہاں، اُن حدود کے علاوہ جنہیں وحیٔ خداوندی کی متعین کردہ مستقل اقدار عاید کریں، اسکے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اسی کا نام ہوتا ہے، آزادی۔

اب آپ اپنی آزادی پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا ہم تقسیم ہند کے بعد فی الواقعہ آزادی سے لذت یاب ہوئے ہیں؟ کیا ہماری ذہنی اور انسانی صلاحیتوں کی سطح، اس مقام سے ذرا بھی بلند ہوئی ہے جس پر وہ ہمارے عہدِ غلامی میں تھی؟ مستقل اقدارِ خداوندی کا ذکر چھوڑیئے کہ موجودہ فضا میں ان کا نام تک بھی نہیں لیا جا سکتا۔ زندہ قوموں کے عام معیار کے مطابق ہی ماپئے اور دیکھئے کہ ہماری علمی، فکری، اخلاقی یا حسنِ ذوق کی سطح وہی ہے جس پر ہم ۱۹۴۷ء سے پہلے تھے، یا اس میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ اس میں تبدیلی ضرور واقع ہوئی ہے۔ اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ ہم اُس زمانے کی سطح سے بھی نیچے گر گئے ہیں اور گرتے چلے جا رہے ہیں۔

پہلے، اپنی علمی درسگاہوں کو لیجئے۔ ہمارا نظامِ تعلیم وہی ہے، جو کبھی ہماری غلامی کے زمانے میں متعین ہوا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن ان درس گاہوں (کالجوں) سے جو نوجوان ڈگریاں لے کر باہر آتے ہیں، ان کی علمی قابلیت کا مقابلہ انگریز کے زمانے کے گریجوایٹوں سے لگائیے اور پھر دیکھئے کہ ہمارا معیار کس قدر پست ہو چکا ہے۔ ان درس گاہوں کے اساتذہ کو دیکھئے اور ان کا مقابلہ زمانہ قبل از تقسیم کے اساتذہ سے کیجئے۔ وہاں بھی آپ کو یہی پستی نظر آئے گی۔ انہی درس گاہوں کے فارغ التحصیل طلبا بعد میں، ملک کا علمی طبقہ بنتے ہیں۔ آپ سرسید اور اقبال کے دور کے علمی طبقہ کو لیجئے، اور پھر ایک نگاہ موجودہ دور کے علمی طبقہ پر ڈالئے، بہ ہیئت مجموعی، علمی انحطاط ابھر کر آپ کے سامنے آجائے گا۔ اُس دور کے علمی سرمایہ کو ہم اپنے لئے آج تک قابلِ فخر سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم حیران ہیں کہ (مستثنیات کو چھوڑ کر) ہم

اس دور کا کون سا سرمایہ اپنی آنے والی نسل کو بطور ورثہ دیں گے؟ چھپنے کو جس قدر کتابیں آج ایک ماہ میں چھپ جاتی ہیں، اس زمانے میں شاید ایک سال میں بھی نہ چھپتی ہوں گی۔ لیکن ذرا اس پر بھی نگاہ ڈالئے۔ کہ ان کتابوں کی عمر کتنی اور علمی قیمت کیا ہوتی ہے؟ کیا یہ تلخ حقیقت ہمارے علمی افلاس کی علامت نہیں؟

تالیف و تصنیف کی دنیا سے آگے بڑھ کر صحافت کے میدان کی طرف آیئے اور دورِ حاضر کی صحافت کا مقابلہ زمانہ قبل از تقسیم سے کیجئے۔ نمایاں فرق آپ کے سامنے آجائیگا۔ تعداد کے اعتبار سے ہزار گنا سے بھی زیادہ لیکن معیار کے اعتبار سے اتنی ہی پست۔ ہمارے دور کا صحافتی نصب العین یہ نہیں کہ عوام کے ذوق، اور فکری سطح کو بلند کیا جائے۔ ہماری تگ و تاز کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ عوام کی سطح کے مطابق مسالہ دیئے جائیں (اور وہ بھی "سنسنی خیز" انداز میں) تاکہ اشاعت بڑھتی جائے۔ اس منافست (RACE) میں ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں سے آگے نکل جائے۔ اور اپنے جریدہ کی پیشانی پر (نہایت فخر سے) "سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار" لکھ سکے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہماری صحافت میں (بہ ہیئتِ مجموعی) دن بدن بازاریت زیادہ اور ثقاہت کم ہوتی جاتی ہے، اور اسی نسبت سے قوم کا مزاج بگڑتا جا رہا ہے۔

فکری دنیا کی طرف آیئے تو اس ضمن میں جس قدر کہیئے اتنا ہی اچھا ہے۔ سرسید نے اپنی انتھک کوششوں اور مجاہدانہ کاوشوں سے، ہمارے فکری دروازوں پر صدیوں کے پڑے ہوئے زنگ خوردہ تالوں کو کھولنے میں جرأت مندانہ اقدام کیا۔ اور اس کے نہایت خوشگوار نتائج قوم کے سامنے آنے شروع ہو گئے قوم میں دورِ حاضر کے علوم کی تحصیل اور عصری تحقیقات میں دلچسپی بڑھتی گئی۔ یہاں وہاں، عقل کے چراغ روشن اور فکر کی شمعیں تابندہ ہونے لگیں۔ قدیم نظریات و تصورات کا جائزہ، فہم و بصیرت اور علم و شعور کی روشنی میں لیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ توہم پرستیاں کم ہونے لگیں اور زندگی کے حقائق ابھر کر سامنے آنے لگے۔ اس سے ذہنوں میں جلا اور فکر میں بالیدگی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ خانقاہیت۔ پیر پرستی، قبر پرستی۔ مُلّا ازم سمٹتے چلے گئے۔ مذہبی مکتبوں اور دارالعلوموں میں کمی اور مدرسوں اور کالجوں میں اضافہ ہونے لگا۔ پیر پرستی، اور قبر پرستی، قوم کے جاہل طبقہ تک محدود ہو کر رہ گئی تقسیم ہند تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد، یہ تمام رجعت پسند قوتیں اس طرح ہجوم کر کے، سیلابِ بے پناہ کی طرح امنڈ کر آگئی ہیں، کہ قوم کا کوئی طبقہ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اب پیر پرستی، اور قبر پرستی، جہلا کے طبقہ کا خاصہ نہیں رہی۔ ملک کا "دانش ور طبقہ" اسے بطور فیشن اختیار کر رہا ہے۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ، بالخصوص افسروں کا طبقہ، پیروں اور خانقاہوں سے وابستگی کا ذکر بڑے

فخر سے کرتا ہے۔ اب آپ کو خانقاہوں کے آستانوں پر، کُرتے اور تہبند سے کہیں زیادہ کوٹ اور پتلون دکھائی دیں گے۔ اور مزاروں سے مرادیں مانگنے، اور "حضرت صاحب" سے تعویذ لینے والیوں میں چیتھڑوں میں ملبوس برقعہ پوش عورتوں سے کہیں آگے، ماڈرن تعلیم یافتہ خواتین نظر آئیں گی۔ اب آپ کو توہم پرستیوں کے افسانے مقبروں سے کہیں زیادہ کلبوں میں سنائی دیں گے۔ ہمارے عہدِ غلامی میں، امتحانات کے قریب، اساتذہ اپنے شاگردوں کو اور زیادہ محنت کراتے تھے۔ لیکن اب آپ (ہمارے دورِ آزادی میں) امتحانات کے قریب، مدرسوں میں، سفید چادروں کے گرد آیۂ کریمہ کا ورد ہوتا دیکھیں گے۔ ملک میں جس قدر نذر اور نیاز اس وقت دی جاتی ہے اور جتنے عرس اور قوالیاں اب ہوتی ہیں، آزادی سے پہلے ان کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا تھا۔ جنکہ ہمارے دورِ غلامی میں، توہم پرستی کے جو مراکز خود زمانے کے ہاتھوں مٹتے جارہے تھے انہیں اب از سرِ نو بنایا، سنوارا، اور اُبھارا جارہا ہے۔ اور اس طرح ملک میں جہالت اور جاہلیت کے نئے نئے چشمے جاری ہوتے چلے جارہے ہیں۔

"روحانیت" کے ان آسمانوں سے نیچے اتر کر، مذہبی پیشوائیت کی زمین کی طرف آئیے۔ تو تقسیم سے پہلے جس قدر مکتب اور دارالعلوم پورے ہندوستان میں تھے، ان سے کہیں زیادہ، صرف مغربی پاکستان میں ہوں گے۔ اور ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ ان "تعلیم گاہوں" سے ہر سال، ہزاروں کی تعداد میں، وہ لوگ باہر آرہے ہیں، جو، لاکھ باہمی اختلافات کے باوجود، ایک بات میں سب کے سب متفق ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ قوم کی ذہنی اور فکری سطح بلند نہ ہونے پائے۔ وہ، فوج در فوج، اس "جہادِ عظیم" میں مصروفِ یلغار رہتے ہیں کہ عقل و فکر کے چراغوں کو گل کر دیا جائے، اور علم و بصیرت کے دروازوں کو اس طرح مقفل رکھا جائے کہ زمانے کے ہزار تقاضے بھی انہیں کھول نہ سکیں۔ وہ عوام کو دن رات توہم پرستی کی افیون پلا کر، اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ جنت تک پہنچنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ وہ آنکھ بند کرکے، ان کے پیچھے پیچھے چلتے جائیں۔ اس طرح وہ ملک کی کثیر آبادی کو اپنے پیچھے لگا کر اتنی قوت حاصل کر لیتے ہیں، کہ وہ جسے جی چاہے ڈرائیں، اور جسے جی چاہے دھمکائیں۔ ہماری غلامی کے زمانے میں، ان حضرات کی تہدید و ترہیب فتاووں تک محدود رہتی تھی لیکن اب ان کا قدم اور بھی آگے بڑھ گیا ہے (مثلاً) اگلے دنوں، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے ڈائریکٹر، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے کسی معاملہ میں اپنی ایسی رائے کا اظہار کر دیا جس سے ان حضرات کو اختلاف تھا۔ اس پر، مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی، کے استاذِ حدیث، مولانا محمد ادریس صاحب نے (ہفت روزہ "الاعتصام" کی ۷ رجون کی اشاعت میں) لکھا:۔

آخر میں ہم عرض کریں گے کہ اخبار میں شائع شدہ بیان اگر واقعی ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا بیان ہے تو حکومتِ پاکستان پر لازم ہے کہ فوراً اس شخص کو ادارہ تحقیقات اسلامی کی ڈائریکٹری، اور اسلامی مشاورتی کونسل کی ممبری سے علیحدہ کرے اور اسلام اور پاکستان کی توہین کے جرم میں اس کو عبرتناک سزا دے۔ اور اس رقم کے عوض اس کی تمام املاک کو ضبط کرے جو اس نے گزشتہ سالوں میں ادارہ تحقیقات سے وصول کی ہے۔ نیز اسکے پاسپورٹ کو ضبط کرکے باہر جانے کے تمام راستے اس پر بند کردے۔

اس تہدید کے بعد لکھا ہے کہ

اگر حکومت اس سلسلہ میں کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھائے گی تو عوام یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ فضل الرحمٰن سے متفق ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ حکومت کو جو دھمکی دی گئی ہے اس کے پیچھے "قوت" کون سی کارفرما ہے؟ یہ کہ "عوام یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ حکومت فضل الرحمٰن کے ساتھ ہے"۔ ان حضرات کو معلوم ہے کہ جمہوری اندازِ حکومت میں، برسرِاقتدار پارٹی کے لئے سب سے زیادہ خطرہ اسی کا ہوتا ہے کہ عوام کی اکثریت اُن کی مخالف نہ ہوجائے اور اس طرح وہ الیکشن ہار جائیں۔ یہ حضرات، اربابِ سیاست کے اس کمزور پہلو سے خوب واقف ہیں۔ اس لئے اس سے اچھی طرح فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس سے آپ نے اس راز کو بھی پا لیا ہوگا، کہ یہ جواب مغربی جمہوریت کو عینِ اسلام قرار دینے کی مہم شروع کی گئی ہے اس کا جذبۂ محرکہ کیا ہے۔ حالانکہ یہی حضرات، تحریکِ پاکستان کی مخالفت یہ کہہ کر کرتے تھے، کہ اس میں حکومت جمہوری ہوگی جو ہندوؤں کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہوگی۔

اندریں حالات، آپ سوچئے کہ اس قسم کے ماحول میں قوم کی فکری صلاحیتوں کا مزید نشوونما پانا تو ایک طرف، جس سطح پر وہ پہلے تھی، اُس سطح کو قائم رکھنا بھی کس طرح ممکن ہے؟ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ قوم کی فکر کے دیئے آہستہ آہستہ گل ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ اندھے جذبات جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

جب کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے کہ اس میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت مفقود ہوجائے اور اس کی جگہ سطحی جذبات عام ہوتے چلے جائیں، تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم میں بداخلاقی عام اور جرائم عالمگیر ہوجائیں۔ یہی کچھ ہمارے معاشرے میں اس وقت ہو رہا ہے۔ یہاں عام جرائم جس طرح وبا کی طرح پھیل رہے ہیں، انہیں تو چھوڑیئے۔ معاشرہ کا سنگین ترین جرم — یعنی جرمِ قتل — بھی اب معاشرہ کا معمول بن چکا

ہے۔ ہماری غلامی کے زمانے میں کیفیت یہ تھی کہ اگر برسوں میں کہیں ایک آدھ قتل کی واردات ہو جاتی تو اس خبر سے سارے علاقے میں اس قسم کی خوف و ہراس کی لہر دوڑ جاتی، کہ لوگ ڈرتے کہ ہم پر کہیں خدا کا عذاب نازل نہ ہو جائے۔ اگر کبھی اس قسم کی آندھی آجاتی جس سے آسمان پر لالی چھا جاتی، تو لوگوں میں چرچا ہونے لگتا، کہ خدا خیر کرے، کہیں قتل کی واردات ہوئی ہے۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہر صبح اخبار اٹھائیے تو ایک ہی شہر میں دو چار قتل کی وارداتوں کی خبریں جلی حروف میں سامنے آجاتی ہیں۔ اور وارداتیں بھی چوری چھپے نہیں ۔ دن دہاڑے، بستے رستے شہر کی گنجان ترین، بارونق شاہراہ پر، ایک شخص کو پکڑ کر، سڑک پر لٹایا جاتا ہے اور اُسے پستول مار کر ایک دم ختم نہیں کر دیا جاتا، بلکہ ٹکوے سے اس کے بدن کا ایک ایک عضو الگ کیا جاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس قصابیت میں کافی وقت لگتا ہے۔ مقتول کی چیخیں آسمان تک پہنچ رہی ہیں لیکن کوئی اس کی مدد کو نہیں پہنچتا، بلکہ ڈر کے مارے لوگ دکانیں بند کر کے دوڑ اور چھپ جاتے ہیں اور قاتل، اپنے کام سے فارغ ہو کر نہایت اطمینان سے چلے جاتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ اسلئے ہوا تھا کہ مقتول نے کسی زمانے میں ان کے خلاف شہادت دی تھی۔

قوم اس قدر مغضوب الغضب کیوں ہو رہی ہے؟ لوگ ذرا ذرا سی بات پر کیوں چاقو چلا دیتے ہیں؟ اس لئے کہ قوم کی فکری صلاحیتیں دبا دی گئی ہیں اور ان کے جذبات کو برابر مشتعل کیا جاتا ہے۔ اسی جذباتیت کا مظاہرہ ہمارے فنونِ لطیفہ کی دنیا میں ہو رہا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ریڈیو سے جو پروگرام نشر ہوتے تھے، آپ ان کا موازنہ آجکل کے پروگراموں سے کیجئے، صاف نظر آجائے گا کہ ان کا معیار کس قدر پست ہو گیا ہے۔ اگر اربابِ متعلقہ سے اس کی شکایت کیجئے، تو جواب یہ ملتا ہے کہ ہمارا کام اپنے سننے والوں کے ذوق کی تسکین ہے جس قسم کا ان کا تقاضا ہوتا ہے، اسی قسم کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ یعنی ان کا کام لوگوں کے معیار کو بلند کرنا نہیں، خود ان کی پست سطح کی طرف اُترتے چلے جانا ہے (اسی مسلک و ذہنیت کو قرآن نے "ہبوطِ آدم" سے تعبیر کیا ہے)۔ جب حکومت کے اداروں کی یہ کیفیت ہو تو کاروباری اداروں کا پوچھنا کیا۔ ان اداروں میں سلیما پکچرز پیش پیش ہے۔ آپ اُن فلموں کو دیکھئے جو ہمارے ہی علاقوں میں، تقسیم ہند سے پہلے بنتی اور اس درجہ مقبول ہوتی تھیں۔ اور اس کے بعد اپنی موجودہ فلموں کو سامنے لائیے۔ صاف نظر آجائے گا کہ ہمارا تحسینِ حسن کا مذاق و معیار کس قدر پست ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس پر کس درجہ بازاریت چھا رہی ہے۔ اس کی وجہ جواز بھی وہی کہ اس باب میں معیار، عوام کی پسند ہے ۔ موسیقی کی طرف آئیے تو فلمی دھنیں فضاؤں کو تھرتھراتی اور قوالیاں محفلوں کو گرما رہی ہیں اور معیاری موسیقی کے حامل (جو دو چار، بدقسمتی سے، ہنوز زندہ ہیں) خود اپنے مزاروں کے چراغ بن کر زندگی کے دن گزار رہے

ہیں ۔ شاعری کی طرف آیئے، تو تقسیم سے پہلے، غالب اور اقبال روزمرہ کی طرح زبانوں پر رواں ہوتے تھے۔ لیکن آج وہ سب قصۂ ماضی بن چکے ہیں۔ اور کسی جگہ اگر کسی "عہدِ رفتہ کی یادگار" کی زبان پر اُن کا کوئی شعر آ بھی جائے، تو سامعین منتظر ہوتے ہیں کہ اس کے بعد اس شعر کا ترجمہ بھی پیش کیا جائے۔ مصوّروں کی دنیا میں دیکھیئے تو "چغتائیانِ قوم" کا ہر پیکرِ تصویر کاغذی پیرہن میں ملبوس، "قوم کی پستیٔ ذوق کا فریادی نظر آئے گا، اور بے آہنگ وحشتوں کے چھلاوے نمائش گاہوں کی زینت بنتے جائینگے۔

یہ ہے وہ مقام جس تک قوم، ذہنی، فکری، اخلاقی اور حسنِ ذوق کے اعتبار سے، اس وقت آچکی ہے۔ اور اس میں دن بدن تنزل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں "تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس" (یعنی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما) کے بنیادی اور اہم ترین فریضہ کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا۔ اس کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں ۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوم کی طبیعی زندگی کے لئے سامانِ پرورش نہایت ضروری ہے۔ لیکن اگر اس کی طبیعی پرورش کا سامان تو بہم پہنچایا جائے، لیکن اس کی انسانی صلاحیتوں کو نظر انداز کر دیا جائے، ۔ تو کچھ عرصہ کے بعد وہ ملک انسانوں کی بستی کے بجائے ایک چڑیا گھر (zoo) بن کر رہ جاتا ہے ۔ زیادہ سے زیادہ ایسا چڑیا گھر جس میں جانوروں کی رہائش اور آسائش کا انتظام اچھا ہو۔ یہی وہ اندازِ زیست ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ وَيَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ ۔ (۴۷/۱۲) ۔ اس میں لوگ انسانی سطح پر زندہ رہنے کے بجائے، حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامانِ پرورش سے متمتع ہوتے ہیں۔ لیکن اس انداز کی زندگی کے متعلق اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ کفر کی زندگی ہے ۔ (وَالَّذِينَ كَفَرُوا) ۔ اور اس کا انجام ایسی تباہی جو سب کچھ جلا کر راکھ کر دے ۔ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲) ۔ یہ ہے ہمارا حاصلِ آزادی۔

---

(۲)

ایک مستحسن اقدام

انسانوں نے مل جُل کر رہنا ہے۔ اور مل جُل کر رہنے کی بنیاد باہمی اعتماد پر ہے۔ غور کیجئے کہ آپ کسی ہوٹل سے، اپنے کسی دوست کے ہاں سے، خود اپنے گھر سے، کس اطمینان کے ساتھ کھانا کھا لیتے ہیں۔ یہ محض اس لئے کہ آپ کو ان پر اعتماد ہے، کہ انہوں نے کھانے میں زہر نہیں ملا دیا۔ آپ کس سکون سے رات کو سو جاتے ہیں، اس لئے کہ آپ کو اپنے گرد و پیش سونے والوں پر اعتماد ہے کہ ان میں سے کوئی رات کو

اُٹھ کر آپ کے سینے میں خنجر نہیں گھونپ دے گا ـــ آپ کس بے فکری سے گھر سے نکل کر باہر چلے جاتے ہیں، اس لئے کہ آپ کو شہر کے ہجوم پر اعتماد ہے کہ وہ آپ کی بوٹیاں نہیں نوچ لیں گے۔ آپ کس سکون سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر، فضا میں معلق ہوائی جہاز میں سفر کر لیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ آپ کو جہاز رانوں کی صلاحیت اور دیانت پر اعتماد ہے ـــ آپ کس بے توجہی سے اپنا سینہ ڈاکٹر کے نشتر کے حوالے کر دیتے ہیں، اسلئے کہ آپ کو ڈاکٹر کی صداقت اور رفاقت پر اعتماد ہے ـــ تمدنی زندگی میں باہمی اعتماد ہی وہ چٹان ہے' جس پر اس کی اس قدر رفیع و وقیع عمارت استوار ہوتی اور قائم رہتی ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر باہمی اعتماد کی یہ چٹان باقی نہ رہے تو اس عمارت کا کیا حشر ہو۔ اگر باورچی یا بیوی پر سے آپ کا اعتماد اٹھ جائے ـــ اور آپ کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہے کہ یہ کہیں کھانے میں زہر نہ ملا دیں، تو آپ کے لئے زندگی عذاب ہو جائے۔ اگر سوتے وقت آپ کو یہ خیال ستائے کہ سوتے میں کہیں کوئی آپ کے سینے میں چھرا نہ گھونپ دے، تو آپ رات بھر آنکھ تک بھی نہ جھپک سکیں، اور ذرا سی آہٹ آپ کو موت کی چاپ بن کر سنائی دے ـــ اگر گھر سے باہر نکلتے وقت آپ کو خیال گزرے کہ نہ معلوم بازار میں کون مجھ پر جھپٹ پڑے، تو بھری بستی آپ کے لئے وحشت کدہ بن جائے ـــ غرضیکہ اگر مل جل کر رہنے والے انسانوں پر سے آپ کا اعتماد اٹھ جائے' تو زندگی آپ کے لئے اجیرن ہو جائے۔ چند ہی دنوں میں آپ پاگل ہو کر ویرانوں کی طرف بھاگ نکلیں' اور وہاں بھی آپ کو انسانوں کا تصور چھلاوا بن کر ڈرائے اور عفریت بن کر ستائے۔

اعتماد ـــ باہمی اعتماد ـــ یہ ہے تمدنی زندگی کا رازِ حیات!

یوں تو' اعتماد' زندگی کے ہر گوشے میں وجہِ سکون اور باعثِ اطمینان ہے، لیکن حکومت اور رعایا (یعنی شہریوں) میں اس رشتہ کی حیثیت رگِ جان کی سی ہوتی ہے۔ اگر اربابِ حکومت کو عوام پر اعتماد نہ رہے تو (اقبال کے الفاظ میں) ان کے لئے یہ "خدائی" دردِ سر ہی نہیں' دردِ جگر بن جاتے ـــ وہ قدم قدم پر جھلا اٹھیں، ان پر وحشت طاری ہو جائے، وہ پاگل ہو جائیں، اور اس پاگل پن میں وہ اس کشتی کے پرخچے اڑانے میں بھی کوئی باک نہ سمجھیں جس کے وہ ناخدا ہی نہیں' بلکہ اس میں وہ خود بھی سفر کر رہے ہیں ـــ اور اگر رعایا کو حکومت پر اعتماد نہ رہے تو ملک میں ایسی انارکی پھیل جائے جس سے قریۂ ملت کی ہر عمارت کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس باہمی اعتماد کی کمی ہے جس کی وجہ سے ہماری حالت یہ ہے کہ (خدا کا دیا) سب کچھ ہونے کے باوجود' ہر قلبِ حساس سے یہ آہ اُبھرتی ہے کہ

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہم جب سنتے ہیں، کہ فلاں ملک کی ایئر پورٹ پر اُتریئے اور کسٹم والوں سے صرف اتنا کہہ دیجئے کہ میرے بکس میں کوئی چیز ڈیوٹی کے قابل نہیں، تو وہ آپ کو جھک کر سلام کرتے ہیں اور مسکرا کر آگے بڑھ جانے کا اشارہ کر دیتے ہیں ـــــ تو اس سے بے اختیار زبان پر آجاتا ہے کہ اے کاش! یہاں بھی یہ صورت پیدا ہو جاتے ـــ اور اسی اعتماد کا نتیجہ ہے کہ اس قسم کی خبریں بھی وہیں سے سننے میں آتی ہیں کہ فوج کے کمانڈر نے کہا کہ اس وقت ایسے دس جوانوں کی ضرورت ہے، جو آگے بڑھ کر دشمن کی توپوں میں سر دے دیں ـــ اور یہ کہ یہ "حکم" نہیں۔ جو رضاکارانہ طور پر اس کے لئے آمادہ ہو، وہ صف سے ایک قدم آگے بڑھ آئے۔ اس نے یہ کہہ کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ پھر جو دیکھا تو صف سے ایک جوان بھی آگے نہ بڑھا۔ اس کی پیشانی پر بل آنے ہی کو تھا کہ ایک جوان ذرا سا مسکرایا۔ اس نے اب ساری بات سمجھ لی۔ صف سے دس جوان آگے نہیں بڑھے تھے، ساری کی ساری صف ایک قدم آگے بڑھ چکی تھی۔

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ اس قسم کے اعتماد کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے، اور کیسے ہوتی ہے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ باہمی اعتماد سے زندگی کا نقشہ کس طرح بدل جاتا ہے۔

بایں الحمد کہ اس قسم کے اعتماد کی طرف ہمارے ہاں بھی ایک قدم اٹھایا گیا ہے۔ اور حیرت ہے کہ یہ قدم اس گوشے سے اٹھا ہے جہاں باہمی بداعتمادی گویا ضرب المثل بن چکی تھی ـــ یعنی مرکزی حکومت کے محکمۂ انکم ٹیکس کی طرف سے۔ اس محکمہ کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی سے کہا جاتا کہ آپ اپنی آمدنی کا گوشوارہ دیانتداری سے صحیح صحیح مرتب کر کے بھیجئے، تو اس کا جواب یہ ہوتا، کہ میں تو ایسا کرنے پر تیار ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس محکمے نے پہلے ہی سے فرض کر رکھا ہے کہ ہر شخص گوشوارہ مرتب کرنے میں بد دیانتی برتتا ہے اس لئے کسی گوشوارہ کو صحیح تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ سو جب ان کی نظروں میں بد دیانت ہی ٹھہرنا ہے، تو بد دیانتی ہی کیوں نہ کی جائے۔

ہم یہاں اس بحث میں بھی نہیں پڑنا چاہتے کہ وہاں یہ روش کیوں پڑ گئی تھی، اور اس میں قصوروار کون تھا۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس محکمہ میں باہمی اعتماد کی عمارت اس حد تک متزلزل ہو چکی تھی ـــ اور حیرت ہے کہ اسی محکمہ کی طرف سے اب یہ اعلان ہوا ہے کہ (ایک خاص حد تک کی آمدنی والے حضرات) اپنا حساب آپ کر کے، انکم ٹیکس ادا کر دیں، ان کا حساب درست تسلیم کر لیا جائے گا۔ انہیں، نہ خود آنے کی زحمت اٹھانے کی ضرورت ہے، نہ اپنے کاغذات پیش کرنے کی حاجت۔

بظاہر یہ تبدیلی شاید زیادہ اہم نہ سمجھی جائے لیکن ہمارے نزدیک، یہ تبدیلی ایسی ہے کہ اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ آنے والا مورخ لگا سکے گا۔ اس سے اس اعتماد کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا ہے جس کے

فقدان سے ہم مقامِ انسانیت سے اس قدر نیچے گر رہے تھے۔ یاد رکھئے! جس شخص کو محسوس ہو کہ آپ اس پر اعتماد نہیں کرتے، تو اس سے یا تو اس کے دل میں آپ کے خلاف جذبۂ انتقام پیدا ہو جائے گا، اور یا وہ اپنی نظروں میں آپ گر جائے گا — دونوں صورتوں میں، اس کے اندر احترامِ انسانیت باقی نہیں رہتا۔ اگر آپ اس پر اعتماد کرنا شروع کر دیں تو اس میں خود اعتمادی کا جذبہ اُبھر آتا ہے۔ اس کی انسانی صلاحیتوں کی نمود ہونے لگ جاتی ہے۔ وہ اپنا بھی احترام کرتا ہے اور دوسرے انسانوں کا بھی — یہ ہے وہ نفسیاتی تبدیلی جو باہمی اعتماد سے ظہور میں آتی ہے اور اس سے معاشرہ کے بہت سے عیوب خود بخود مٹ جاتے ہیں اس اعتبار سے محکمہ انکم ٹیکس کا یہ اقدام، بڑا ہی مستحسن اور درخورِ ستائش ہے اور ہم اس پر ارباب متعلقہ کو مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں، ہم انہیں ایک خطرہ سے آگاہ کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ عدم اعتماد کی وجہ سے ہماری قوم جس حالت تک پہنچ چکی ہے، اس کی رُو سے بعض (یا شروع شروع میں بہت سی) صورتوں میں اسکا بھی امکان ہے کہ لوگ غلط گوشوارے مرتب کریں۔ ہم ارباب متعلقہ سے بزورِ گزارش کریں گے کہ وہ ایسی صورت میں گھبرا نہ جائیں — معاشرہ میں جو خرابیاں عام ہو جائیں، ان کی اصلاح، وقت طلب بھی ہوتی ہے اور سست رفتار بھی — یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ان لوگوں کو، جو اس قسم کی اصلاح کا جذبہ لے کر اٹھیں، متنبہ کیا ہے کہ یاد رکھو! یہ کام ایسا ہی ہے، جیسے نامانوس وحشی پرندوں کا سدھانا۔ اس کے لئے بڑے تحمل، برداشت اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس میں ضبط و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، یا اس صبر آزما مرحلہ میں استقامت نے آپ کا ساتھ نہ دیا، تو وہ پرندے پھر سے اُڑ جائیں گے اور پھر آپ کے پاس تک بھی نہ پھٹکیں گے — اگر کچھ لوگوں نے غلط گوشوارے مرتب کر دیئے تو اس سے محکمہ کو کچھ مالی نقصان ہوگا۔ لیکن اس نقصان کے بدلے میں، قومی اعتماد کی جو متاعِ گراں بہا حاصل ہوگی اس کی قیمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ اور اگر آپ نے (خدانخواستہ) جھلا کر، اس اعتماد کے رشتے کو توڑ دیا، تو اس کے بعد جس قسم کی بے اعتمادی پیدا ہوگی، اس سے پیدا شدہ نقصان کا بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لئے آپ ضبط، اور تحمل سے کام لیجئے اور اس اعتماد کے سلسلہ کو اور آگے بڑھاتے جائیے۔ قوم کے تمام سنجیدہ طبقہ کی اخلاقی تائید آپ کے ساتھ ہے۔ خدا کرے کہ آپ بھی اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہیں اور اس تجربہ کے بعد، حکومت کے دوسرے محکمے بھی اس قسم کے اقدامات کرنے لگ جائیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس کا سہرا بھی آپ ہی کے سر ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی ہم گوشوارے بھیجنے والوں کی خدمت میں بھی گزارش کرنا چاہتے ہیں۔ کہ محکمہ نے

آپ کی دیانت پر بھروسہ کیا ہے، تو آپ اس بھروسہ میں خیانت نہ کیجئے۔ غلط گوشوارہ مرتب کرنے سے آپ کچھ پیسے ضرور بچالیں گے لیکن سوچئے کہ اس سے آپ خود اپنی نظروں میں کس قدر ذلیل ہو جائیں گے اور اگر آپ کی ان حرکات کی وجہ سے، اس اعتماد کے شیشے میں بال آگیا، تو اس سے کس قدر عظیم قومی نقصان ہوگا ——— اس کے ساتھ ہی آپ اتنا بھی سوچئے کہ آپ مسلمان ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ اس دعوے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اگر آپ غلط بیانی سے انکم ٹیکس کے محاسبوں کی نگاہوں سے کچھ چھپا بھی لیں گے تو وہ، اس محاسب کی نگاہوں سے کبھی نہیں چھپ سکے گا جو آپ کے قلب کے دفتر کے اندر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ باقی رہی یہ ابلیسی دلیل جس کا آجکل عام چلن ہے کہ "— غلط معاشرہ میں سب کچھ جائز ہے" تو اس سے آپ اپنے آپ کو فریب دے سکتے ہیں، خدا کے "قانونِ مکافات" کو فریب نہیں دے سکتے۔

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

۱۔ قرآن کریم مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے آخری مکمل اور محفوظ ضابطۂ ہدایت ہے جسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اس لئے حضورؐ کی سیرت کے نقوشِ قدم اسلامی زندگی کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

۲۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق جو باتیں ہماری کتب روایات و تاریخ میں آئی ہیں، ان میں سے وہی صحیح ہو سکتی ہیں جو قرآن کریم کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ جو حکومت، قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو ملک میں عملاً نافذ کرے گی — اسے خلافت علیٰ منہاج رسالت یا اسلامی مملکت کہا جائے گا۔

۴۔ اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی — خوراک، مکان، لباس، علاج وغیرہ — بہم پہنچائے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت میں ملوکیت (یعنی خدا کے قوانین کے بجائے انسانوں کے خودساختہ قوانین کا عمل)، تھیاکریسی (یعنی قانون کے معاملہ میں مذہبی پیشواؤں کے حکم کا قولِ فیصل سمجھے جانا) اور سرمایہ داری (یعنی رزق کے سرچشموں پر امت کی بجائے افراد کا قبضہ و اقتدار) نہیں ہوگا۔

۶۔ اسلامی مملکت میں مناصب و مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی اور پختگیٔ سیرت و کردار ہوگا۔

۷۔ طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے اسلامی نظام کے قیام کے لئے فکری اور آئینی کوشش کرتا ہے۔ اسکا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے، نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے کیونکہ فرقہ بندی قرآنِ کریم کی رُو سے شرک ہے۔ امت کے موجودہ فرقے جیسطرح نماز، روزہ وغیرہ اسلامی شعائر کے پابند ہیں یہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا کیونکہ اس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں۔ تو طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اسکا ساتھ دیجئے۔

ناظم

دین کی باتیں

پرویز صاحب کے درس قرآن کریم کے اہم نکات ۔۔۔ مرتبہ۔ محترمہ ثریا عندلیب

۳۹۔ کسی کی کمی پورا کرنے کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی کمی پوری ہوگئی ۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ کا مفہوم یہی ہے۔

۴۰۔ تم نیکی تک پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک تم اپنی متاعِ عزیز کو دوسروں کے لئے صرف نہ کرو۔

۴۱۔ ساری مخلوق ایک کنبہ ہے اور اس کنبہ کی پرورش و تربیت کرنے والی حکومت کا نام اسلامی حکومت ہے۔

۴۲۔ مسلمان اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگی کی حالت میں کیوں نہ رہنا پڑے۔

۴۳۔ ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی اینٹوں کی مانند ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو تھامے اور سنبھالے رکھتی ہے۔

۴۴۔ انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔

۴۵۔ قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا۔

۴۶۔ اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا۔ یعنے مردہ انسان۔

۴۷۔ اسلام وحدتِ امت کا نام ہے۔ جب امت میں اختلاف ہونے سے فرقے پیدا ہو جائیں تو وہ اسلامی زندگی نہیں کہلا سکتی۔

۴۸۔ نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک بلندئ اخلاق و کردار کا بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) ہے جس کے اتباع میں شرفِ انسانیت کا راز پنہاں ہے۔

۴۹۔ جو لوگ اس دنیا سے چلے گئے جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے اور جو تم کرو گے اسکی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی۔ تم سے یہ پوچھا جائیگا کہ تم نے کیا کیا تھا۔ یہ قطعاً نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباؤ و اجداد نے کیا کیا اور کیا کہا تھا۔

نقد و نظر

۱۔ ہماری قومی جدوجہد (۱۹۳۸ء)۔

اس حقیقت کے اعتراف سے کون سی حساس نظریں زمین میں نہیں گڑ جائیں گی، کہ ہمارے ہاں اس وقت تک نہ تو ہماری جنگِ آزادی کی کوئی مستند تاریخ ہے جسے قومی مساعی کا اجتماعی نتیجہ قرار دیا جائے اور نہ ہی قائداعظمؒ کی کوئی قابلِ اعتماد سوانح حیات۔ یہ دونوں چیزیں دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ان حالات اگر کوئی مخلصانہ انفرادی قدم اس سمت کو اٹھتا نظر آتا ہے تو وہ ہمارے نزدیک مستحق تشکر و امتنان قرار پاتا ہے۔ اسی قسم کے انفرادی اقدام کا نتیجہ، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی زیر تبصرہ تصنیف ہے۔ جسے البیان پبلشرز (چوک انار کلی، لاہور نے حسنِ اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے 'اس سلسلہ کی پہلی کڑی — اقبال کے آخری دو سال — میں، مسلم لیگ کی تحریک کے دورِ اول (۱۹۳۶ء تا اپریل ۱۹۳۸ء) سے بحث کی تھی۔ یہ اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں مئی تا دسمبر ۱۹۳۸ء کے احوال و کوائف کو سامنے لایا گیا ہے۔ مصنف چونکہ اس تحریک کے میدان میں خود عملاً شریک تھے اس لئے ان کی پیش کردہ روئیداد شنید و گوید نہیں بلکہ دیدہ گوید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ضروری مسالہ کی فراہمی میں بھی بڑی کاوش سے کام لیا ہے اور اندازِ بیان بھی بڑا دلکش ہے۔ خدا کرے کہ اس سلسلہ دراز کی باقی کڑیاں بھی اسی طرح رفتہ رفتہ مربوط ہوتی جائیں اور قوم کا یہ فرضِ عین، کم از کم، فرضِ کفایہ کی حیثیت ہی سے تکمیل تک پہنچ جائے، اگرچہ ظاہر ہے کہ جس انداز سے یہ تاریخ اجتماعی پروگرام کے ماتحت مرتب ہو سکتی تھی، انفرادی طور پر اس کی حیثیت ویسی نہیں ہو سکتی۔ اور ویسے بھی اس کا تعلق (سابقہ) پنجاب میں تحریکِ پاکستان کی تاریخ سے ہے۔ لیکن ایں ہم غنیمت است۔ کتاب بڑے سلیقہ سے سفید کاغذ پر چھپی ہے ضخامت تین صد صفحات۔ قیمت مجلد پندرہ روپیہ۔

۲۔ پیغامِ حق

سید عبدالقیوم صاحب کی کتاب — حقیقت المسیح — پر فروری ۱۹۶۶ء کے طلوعِ اسلام میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ انہی کی دوسری تصنیف ہے اس میں انہوں نے — عذاب و ثواب قبر، حشر و اجساد، منکر نکیر، مُردوں کو شعور و احساس، ایصالِ ثواب، روح، نفس، شفاعت، پلصراط، نبی اور علمِ غیب، حاضر و ناظر، نور و بشر، شقِ صدر، معراج، نزولِ مسیح و مہدی، جنات، جیسے مسائل و عقائد سے بحث کر کے بتایا ہے کہ اس سلسلہ میں غلط تصورات کیا ہیں اور قرآنِ مجید کی ان کے متعلق تعلیم کیا ہے؟ جیسا کہ ہم نے فروری کی اشاعت میں لکھا تھا، سید صاحب، دین میں سند و حجت صرف قرآن پاک کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے زیرِ نظر مسائل و اعتقادات کے متعلق بھی انہوں نے قرآن پاک ہی سے تردیدی یا تائیدی دلائل و اسناد پیش کئے ہیں اور اس میں محنت اور کاوش سے کام لیا ہے۔ کتاب نیوز پرنٹ کاغذ پر چھپی ہے اور چھوٹے سائز کے ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت بلا جلد چار روپے ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ قیومیہ۔ سکول محلہ، منڈی بہاؤ الدین۔ (گجرات)۔ کتاب کے شروع میں فہرست دیدی جاتی تو عنوانات کی تلاش میں دقت نہ ہوتی

ادارۂ طلوعِ اسلام کی تازہ پیشکش

عربی خود سیکھئے

اس کتاب سے عام اردو پڑھے لکھے حضرات چند ماہ کے عرصہ میں اتنی عربی زبان سیکھ سکتے ہیں جس سے قرآن کریم سمجھ میں آجائے۔ اور روزمرہ کے عام معاملات سے متعلق اظہارِ خیال کیا جا سکے۔ کتاب کا انداز بڑا سائنٹفک اور طرزِ بیان بالکل سادہ اور سلیس ہے۔ عام استفادہ کے پیشِ نظر اسے چیپ ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے قیمت اڑھائی روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ لاہور

پیشگی خریداران متوجہ ہوں!

ادارہ کی طرف سے حال ہی میں دو نئی کتابیں شائع ہوئی ہیں —
(۱) عربی خود سیکھئے۔ اور (۲) مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں — ۱ کی قیمت اڑھائی روپے ہے اور ۲ کے چیپ ایڈیشن کی قیمت تین روپے اور اعلیٰ ایڈیشن کی قیمت مجلد ۵ روپے ہے۔ حسبِ قاعدہ یہ کتابیں تمام پیشگی خریداران کو بھیجی جاتی ہیں۔ کتاب "عربی خود سیکھئے" انہیں بھیجی جا چکی ہے۔ دوسری کتاب عنقریب بھیجی جائے گی۔ اس کتاب کا چیپ ایڈیشن بھیجا جائے گا لیکن اگر آپ اعلیٰ ایڈیشن چاہتے ہوں تو اس امر کی اطلاع ۱۵ ر نومبر تک دے دیں۔ شکریہ

ناظم

ظلم کا انجام

"اُن کی تباہی پر نہ آسمان رویا، نہ زمین
کی آنکھ نم آلود ہوئی" ــــ (القرآن العظیم)

(پرویز)

دو ذہنیتوں کا فرق قابلِ غور ہے۔

ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا انتظام کرلوں کہ قانون کی گرفت میں نہ آسکوں، یا اگر اس کی گرفت میں آبھی جاؤں تو اپنے اثر و رسوخ، سفارش، رشوت سے مواخذہ سے بچ جاؤں تو پھر مجھے کسی کی پرواہ نہیں، میں جس پر چاہوں ظلم و زیادتی کروں، جن طریقوں سے چاہوں اپنے مفاد حاصل کروں، جس قانون کی جی چاہے خلاف ورزی کروں، جس قسم کی چاہوں دھاندلی مچاؤں، میں اپنے ہر مقصد میں کامیاب رہوں گا اور مجھے کسی قسم کا خوف و خطرہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک قوم سوچتی ہے کہ اگر میں اپنے ہاں کافی قوت جمع کرلوں، تو پھر جس قوم کا جی چاہے گلا دبالوں، جسے چاہوں اپنا غلام بنالوں، جس پر چاہوں ظلم و استبداد کروں، ہر طرح کی کامیابیاں اور کامرانیاں میرے حصے میں آئیں گی۔ مجھے کسی سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوگا۔

لیکن ایک دوسرا شخص یا قوم ہے جسے ہر طرح کی قوت حاصل ہے۔ اس کا اثر و رسوخ بھی کافی ہے، دولت اور ذرائع کی بھی کمی نہیں، اسے دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنے کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ اسے جائز و ناجائز طریق سے مال و دولت حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لوٹ کھسوٹ اور سلب و نہب کی کوئی باز پرس نہیں کرسکتا۔ غرضیکہ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو اس کا ہاتھ روک سکے یا گلا دبا سکے۔ اس کے گرد و پیش افراد (یا اقوام) دن دہاڑے ناانصافیاں کرنے اور (بظاہر) پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے سامنے زندگی کا ایک محکم نظریہ، ایک اٹل قانونِ حیات، ایک غیر متبدل کلیہ ہے جس کی صداقت پر اُسے یقین کامل ہے یعنی یہ کہ۔

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ - (۱۲/۲۳)
یاد رکھو! ظلم کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ظالم کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی،
وہ کبھی پنپ نہیں سکتا،

اس نظریہ زندگی، اس قانونِ حیات، اس محکم کلیہ پر اس کا ایمان، ظلم وجور کے ہر قسم کے ذرائع، اور مواقع کے باوجود، اسے کبھی ظلم وجور پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تم کس فریب میں مبتلا ہو، دیکھتے نہیں کہ لوٹ کھسوٹ کرنے والے کس طرح دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، ایسے مواقع روز روز نہیں آتے۔ لیکن وہ اس ترغیب وتحریص کے باوجود، کامیابی کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرتا۔ اور اپنے "ناصح مشفق" سے سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ جسے تم ان کی ترقی سمجھتے ہو، یہ سب "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ---- (۶/۴۵)
ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

زندگی کا یہ قانون اٹل ہے کہ هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ -- (۶/۴۷) ظالم قوم کی تباہی یقینی ہے۔ وہ زندگی کی شادابیوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتی ہے ---- (لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ - (۷/۴۴)

اول الذکر ذہنیت کا نام ہے ---- خدا سے انکار ---- اسے کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کے ابدی قوانین کی صداقت سے انکار، ---- اور ثانی الذکر ذہنیت کو خدا پر ایمان کہتے ہیں اور اس قسم کا ایمان رکھنے والوں کو قرآن کی زبان میں مومن اور مسلم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

آئیے! ہم دیکھیں کہ ہمارا شمار کس گروہ میں ہوتا ہے۔

ظلم کسے کہتے ہیں؟

اس مقصد کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ظلم کہتے کسے ہیں؟ اس کے معانی کیا ہیں اور مفہوم کیا؟

لفظ ظلم کے بنیادی معنی، کمی کرنے کے ہیں۔ یعنی کسی کے حقوق و واجبات میں کمی کرنا۔ اسے وہ کچھ اور اتنا نہ دینا جس کا وہ حقدار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہر قسم کی ناانصافی، جور، استبداد، قانون کی خلاف ورزی اور سرکشی آ جاتی ہے لیکن امام راغب نے اس (لفظ) کی ایک ایسی تعریف (DEFINITION) دی ہے جو

اس کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ یعنی ظلم سے مراد ہے۔

کسی شے کا اس مقام پر نہ ہونا جس مقام پر اسے ہونا چاہیئے۔

اسی سے لفظ "ظلمت" آتا ہے جس کے معنی ہیں ـــ جس مقام پر روشنی ہونی چاہیئے تھی وہاں روشنی کے بجائے تاریکی ہونا۔

یہ تو ہوئے اس کے لغوی معنی۔ لیکن قرآن کریم' اس کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو اس صراحت اور وضاحت سے سامنے لایا ہے کہ ان کی روشنی میں' اس جامع حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری ہی نہیں رہتی۔ کہ ظلم کسے کہتے ہیں اور ظالم کون ہوتا ہے۔

شرک سب سے بڑا ظلم ہے

سب سے پہلے وہ ظلم کے ایک ایسے گوشے کو سامنے لاتا ہے جس کی طرف کسی کی نگاہ ہی نہیں اُٹھ سکتی تھی۔ آپ نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ شرک' ظلم ہے۔ اور شرک' ظالم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا اعلان ہے کہ شرک' ظلم ہی نہیں بلکہ "ظلم عظیم" ہے (۳۱/۱۳)۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے توحید (یعنی ایک خدا کو ماننے) سے مراد یہ ہے کہ انسان' صرف قوانین واحکامِ خداوندی کی اطاعت کرے۔ اس کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کرے۔ اگر اس نے' خدا کے علاوہ کسی اور کے احکام وقوانین کی اطاعت کی' تو اس نے گویا' اس شخص (یا قوت) کو اس اقتدار واختیار میں شریک کر لیا جو صرف خدا کے لئے مختص تھا۔ اس سے یہ شخص (یا قوت)' اس مقام پر نہ رہے جس مقام پر انہیں رہنا چاہیئے تھا۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا؛

دوسری طرف اُس انسان کو لیجئے جو شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ خدا نے انسان کو کائنات میں سب سے بلند مقام عطا فرمایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ـــ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ۔ (۴۵/۱۳)' جو کچھ زمین وآسمان میں ہے' خدا نے اس سب کو تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے۔" یہ تو رہا خارجی کائنات کے متعلق۔ باقی رہے دوسرے انسان' تو اس نے کہا ہے کہ ـــ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اب اگر ایک انسان' خارجی کائنات کی کسی قوت کے سامنے جھکتا ہے تو وہ اپنے سے ادنٰی شے کو' اپنے سے زیادہ عظمت کا مستحق قرار دیتا ہے اور اگر کسی انسان کے احکام کے سامنے جھکتا ہے تو یہ اپنے جیسے انسان کو اپنا حاکم قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ عمل' دونوں صورتوں میں شرف انسانیت کی تذلیل کا موجب ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اس مقام پر نہیں رکھا جس

مقام پر انسان ہونے کی حیثیت سے آسے ہونا چاہیئے اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

شرک کی پہلی صورت اگر خدا کے خلاف شرک تھا تو دوسری صورت، خود انسان کی اپنی ذات کے خلاف شرک ہے اور یہ "ظلم عظیم" ہے۔

شرک (ظلم عظیم) کی اس شکل کو سامنے رکھیئے اور پھر دیکھیئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں، جو اس جرم کے مرتکب نہیں ہو رہے ۔۔۔ زندہ انسان تو ایک طرف ہماری ذلت کی انتہا ہے کہ ہم مردہ انسانوں تک کے حضور جھکتے اور گڑگڑاتے ہیں اور ہر سانس میں غیر خداوندی احکام و قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ (یاد رکھیئے! خدا کی عبادت کے معنی خدا کی اطاعت ہیں۔ یعنے اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا)

یہاں تک تو شرک (یعنی ظلم عظیم) کی اس نوع کا ذکر تھا جس میں انسان کسی دوسرے کی محکومیت اختیار کرتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں، ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خدا کے احکام و قوانین کے خلاف تم اپنے جذبات و خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جاؤ تو یہ بھی شرک ہے۔ تمہارے جذبات کا صحیح مقام یہ ہے کہ ان سے، قوانین خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے۔ نہ یہ کہ انہیں اپنے آپ پر مسلط کر لیا جائے یہ بھی ظلم ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (۳۰/۲۹)

یہ ظالم، وحی کی روشنی کے بغیر، اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔

بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی کہ اتباعِ جذبات کو ظلم سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ظلم و تعدی کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ انسان قوانین خداوندی کو چھوڑ کر، اپنی من مانی کرنے لگ جائے۔ اسی کو "اتباعِ جذبات بغیر علم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو شخص، اپنے جذبات و خواہشات کو وحی کے تابع رکھے اور یوں تمام معاملات کے فیصلے، قوانینِ خداوندی کے مطابق کرے اس سے ظلم سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔

ظالم حکومت

یہی چیز جب انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر انسانوں کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہو جائے، تو اس وقت یوں کہا جائے گا کہ عدل و انصاف پر مبنی حکومت وہی کہلا سکتی ہے جس میں تمام امور کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق ہوں۔ جو نظامِ مملکت، قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم نہ ہو، قرآن کریم اسے ظالم کہہ کر پکارتا ہے۔ سورۃ مائدہ میں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (۵/۴۵)

جو حکومت، وحی خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتی۔ تو یہی لوگ ہیں جنہیں ظالم کہا جاتا ہے۔

منافقت

ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ جب دیکھا جائے کہ خدا کے کسی حکم یا قانون کے مطابق فیصلہ لینے میں فائدہ ہوتا ہے، تو اس کی اطاعت اختیار کر لی جائے۔ لیکن جو قانون اپنے خلاف جاتا ہو اس سے اعراض برتا جائے۔ قرآن کریم اس منافقانہ طرز زندگی کو بھی ظلم سے تعبیر کرتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ :-

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی اطاعت بھی کرتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کا ایک گروہ اس اطاعت سے روگردانی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ درحقیقت مومن ہے ہی نہیں۔

اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ جب انہیں اس نظام کی طرف بلایا جاتا ہے جسے خدا کے رسول نے احکام خداوندی نافذ کرنے کے لئے قائم کیا ہے تاکہ وہ ان کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرے، تو وہ گروہ اس سے اعراض برتتا ہے لیکن اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا تو وہ اس کی اطاعت کے لئے لپک کر آتے ہیں ..... اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (۲۴/۴۸-۵۰)

یہ لوگ بھی ظالم ہیں۔

غلط نظریۂ زندگی

اصل یہ ہے کہ اس قسم کا منافقانہ انداز اختیار ہی وہ کرتا ہے جسے صحیح نظریۂ زندگی پر ایمان نہ ہو۔ نظریۂ زندگی ہی (جسے قرآن کلمہ کہہ کر پکارتا ہے۔ اور دور حاضرہ کی اصطلاح میں جسے آئیڈیالوجی کہا جاتا ہے) انسانی عمل کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار ہوتا ہے۔ غلط نظریۂ زندگی کو نہ خود ثبات ہوتا ہے، نہ ہی اس بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارتِ اعمال استوار ہو سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے غلط نظریۂ زندگی کے حاملین کو بھی ظالم کہہ کر پکارا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

صحیح نظریۂ زندگی کی مثال ایک ایسے عمدہ پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں محکم و استوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے آسمان میں جھولے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت "قانونِ خداوندی کے مطابق" ہر زمانے میں، ہر موسم میں، پھل دیئے جاتا ہے۔ اس طرح اللہ بسیط حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں۔

اس کے برعکس، غلط نظریۂ زندگی کی مثال ایک ایسے نکمے درخت کی سی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ، زمین کے اوپر ہی اوپر ہو، کہ اسے جب جی چاہے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔

اسطرح خدا، اس محکم نظریۂ زندگی کی رُو سے، ایمان والوں کی جماعت کو ان کی دنیاوی زندگی میں بھی ثبات و تمکن عطا کر دیتا ہے۔ اور اُخروی زندگی میں بھی، اس کے برعکس غلط نظریہ زندگی کے حامل (ظالمین) کی تمام کوششیں رائگاں جاتی ہیں اور یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ ($\frac{14}{24-27}$)

دو نظریاتِ حیات

ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ جسم کی پرورش اور آسائش اس لئے ضروری ہے کہ زندگی کی موجودہ سطح پر، یہ اس کی ذات کا مرکب ہے اور اس کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ۔ زندگی کا حقیقی مقصود انسانی ذات کی نشو و نما ہے اس لئے انسان جو کام بھی کرے اس میں دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ کس حد تک اسکی ذات کی نشو و نما کے لئے ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ جس عمل کا جذبۂ محرکہ یہ ہو اسے ثبات و قرار ہوتا ہے کیونکہ وہ گویا اس کی ذات کا جزو بن جاتا ہے جو جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔

اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ زندگی بس اسی جسم کی زندگی ہے۔ اس کے خاتمہ پر خود انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریۂ زندگی کا حامل جو کچھ کرے گا، اس لئے کرے گا کہ اسے جسم کی پرورش و آسائش کا سامان ہاتھ آجائے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام بھی کرے گا جسے عام اصطلاح میں "نیکی" کہا جاتا ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ اپنی نمود و نمائش ہوگا جس سے انسان کے ایگو کی تسکین ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اعمال کے لئے بقا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم نے اسے "اپنی ذات پر ظلم" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:۔

ایسے لوگوں کے پیشِ نظر صرف طبیعی زندگی کی آسائشیں ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے جو کچھ صرف کیا جائے اس کی مثال ایسی ہے جیسے شدت کی سرد ہوا چلے اور ان لوگوں کی کھیتی تک جا پہنچے، جنہوں نے قانونِ خداوندی کے مطابق اس کی حفاظت کا سامان نہیں کر رکھا، تو یہ ہوا ان کی کھیتی کو تباہ کر دے گی۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔ یاد رکھو! خدا کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا، لوگ خود اپنے آپ پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ (۳/۱۱۶)

غلط معاشی نظام

ظلم کا عام مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کے واجبات پورے پورے ادا نہ کئے جائیں۔ ان کی حقوق کی تلفی کیجائے دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھا لیا جائے۔ محنت کش کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دیا جائے۔ دوسروں کی محنت کی کمائی پر تن آسانی اور عیش سامانی کی زندگی بسر کیجائے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہ سب خرابیاں غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس لئے غلط معاشی نظام بجائے خویش بہت بڑا ظلم ہے اور اس قسم کے نظام کے حامل سب سے بڑے ظالم۔ قرآن کریم میں معاشیات کے متعلق اس قدر وضاحت اور کثرت سے آیا ہے کہ ضمنی طور پر اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ (میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں) اس لئے اس مقام پر اس کے صرف دو ایک گوشوں کو سامنے لایا جائے گا۔ مثلاً سورۃ النحل میں ہے۔

قوموں پر تباہیاں کیوں اور کب آتی ہیں، اسے ایک مثال سے سمجھو۔ ایک بستی تھی، جسے خارجی خطرات کی طرف سے امن اور داخلی کشمکش سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف ہر سمت سے سامانِ رزق کھنچے چلا آتا تھا۔ اس کے رہنے والے بڑے خوشحال اور فارغ البال تھے لیکن انہوں نے خدا کی ان بخشائشوں کی ناقدر شناسی کی۔ (بڑے بڑے لوگوں نے انہیں اپنے لئے سمیٹنا اور چھپانا شروع کر دیا۔) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا ساختہ پرداختہ تھا۔

ان کے پاس خود انہی میں سے خدا کا ایک پیغامبر آیا۔ لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا تو ان پر ہلاکت کا عذاب مسلط ہو گیا۔

اور یہ سب اسلئے ہوا کہ هُمْ ظَالِمُونَ۔ وہ ظالم تھے۔ (۱۶/۱۱۲-۱۱۳)

اسی قسم کی مثال اس نے سورۃ کہف (آیات ۴۲-۳۲) میں بھی دی ہے اور تباہ ہونے والے کے متعلق کہا ہے کہ هُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهٖ۔ اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کی شکل میں سامنے آیا۔

ننانویں دُنبیاں

غلط معاشی نظام کی ایک بنیادی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس میں بڑا سرمایہ، چھوٹے سرمایہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں غریب، غریب تر۔ اور امیر، امیر تر ہوتے چلے جاتے ہیں ظلم کی یہ وہ شق ہے جسے قرآن کریم نے، حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ کے سلسلہ میں یوں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ان کے پاس دو شخص اپنا مقدمہ لیکر آتے۔

> مستغیث نے کہا کہ فریق ثانی میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانویں دنبیاں ہیں اس لئے بڑا خوش حال ہے اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے۔ جو میری معاش کا واحد سہارا ہے اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ مدد کرے۔ مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دنبی بھی مجھے دیدے۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحب اثر۔ اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ اب آپ فیصلہ کیجئے کہ کیا اسکا یہ مطالبہ جائز ہے۔
>
> داؤدؑ نے کہا کہ اس شخص کا یہ مطالبہ سراسر ظلم اور زیادتی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ جب بھی مل جل کر رہتے اور کاروبار میں باہمی شراکت کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ (۳۸/۲۴-۲۳)

ربٰو

بڑا سرمایہ دار دوسروں کی محنت کی کمائی کو کس طرح غصب کر لیتا ہے، اسے قرآن کریم نے ربٰو سے تعبیر کیا ہے۔ ربٰو کے معنے صرف سود نہیں۔ اس سے مراد ہے سرمایہ کا معاوضہ لینا خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ قرآن کریم کی رُو سے، معاوضہ صرف محنت کا ہو سکتا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ سود بھی اسی لئے حرام ہے کہ اس میں معاوضہ، سرمایہ کا لیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ جس نے کسی کو کچھ سرمایہ دیا ہے اسے صرف سرمایہ واپس لینے کا حق ہے۔ اس سے زاید کچھ نہیں۔ بڑا جامع فقرہ ارشاد فرمایا ہے جب کہا ہے کہ اس طرح سے۔

لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (۲/۲۷۹)

نہ تم کسی پر ظلم کروگے، نہ کوئی تم پر ظلم کرے گا۔

لہٰذا، محض سرمائے کے بدلے میں دوسروں کی محنت سے کچھ لے لینا ظلم ہے۔ موجودہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی اس پر ہے۔

مُترفین

جو لوگ خود محنت نہیں کرتے بلکہ (اپنے سرمایہ کے زور پر) دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کر لیتے، اور اس طرح تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں، قرآنِ کریم انہیں مترفین کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسی قوم کا انجام کیا بتایا ہے جس میں اس قسم کا معاشی نظام رائج ہو، یہ غور سے دیکھنے کی چیز ہے۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔

ہم نے تم سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔ ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے جا رہے تھے اور ان سے کہا جا رہا تھا کہ تم اس روش کو چھوڑ دو، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ وہ محسوس طور پر اُن کے سامنے آ گئے، تو وہ انہیں دیکھ کر لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت وہ بھاگ کہاں سکتے تھے۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ مت بھاگو اور اُلٹے پاؤں اپنی انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو (مَا اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ) جنہیں تم نے دوسروں کی کمائی سے حاصل کر رکھا تھا، اور ان محلات کی طرف پلٹو جن میں تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ سمجھا کرتے تھے۔ وہاں چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا۔

اُس وقت انہیں اس حقیقت کے اعتراف کے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے اور اپنے کیے پر سخت متاسف۔

لیکن اُس وقت اِس ندامت اور تاسف سے کیا ہو سکتا تھا۔ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آ جائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ برابر چلاتے رہے کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں وہ ان پر بے حد متاسف ہیں۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ایسے کر دیا

جیسے کٹا ہوا کھیت، یا بجھا ہوا شعلہ۔ (۲۱/۱۵-۱۱)

ان تباہ ہونے والوں کے متعلق دوسرے مقام پر کہا ہے کہ

ان کا یہ حال تھا کہ یہ ظالم اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کرتے جاتے، تاکہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے، خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گزرے۔ یہ تھے ان کے وہ جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آئی تھی۔

یاد رکھو! خدا نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ کسی بستی کو یونہی اندھا دھند ظلم و زیادتی سے تباہ کر دے، دراں حالیکہ وہاں کے رہنے والے، اپنے اور دوسروں کے حالات کو سنوارنے والے ہوں۔ (۱۱/۱۱۶-۱۱۷)

باطل

اسی کو قرآن کریم نے "دوسروں کے مال کو باطل طریق سے کھا جانے" سے تعبیر کیا ہے (۴/۲۹) اور کہا ہے کہ — وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا (۴/۳۰) یاد رکھو! جو معاشرہ ظلم و سرکشی سے ایسی روش اختیار کرے گا وہ بہت جلد تباہیوں کی آگ میں جھلس کر رہ جائے گا۔ چونکہ اس قسم کا ظلم و جور انہی لوگوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں، جن کا جتھہ یا پارٹی کوئی نہ ہو۔ اس لئے اسے خاص طور پر دہرایا گیا۔ کہ

یاد رکھو! جو لوگ ظلم و زیادتی سے ایسے لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں، ان کے متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔ (۴/۱۰)

مذہبی پیشوائیت

یوں تو قرآن میں ہر ناجائز طریق کو باطل کہا گیا ہے لیکن، حق کی ضد ہونے کی بنا پر اس سے مراد وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو بغیر کسی تعمیری کام کرنے کے، مفت میں بیٹھے دوسروں کی کمائی کھاتے رہیں۔ یعنی ایک تو وہ گروہ تھا جو اپنا سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت غصب کرتا تھا لیکن یہ وہ گروہ ہے جو سرمایہ تک بھی نہیں لگاتا اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ گروہ ہے مذہبی علماء اور روحانی پیشواؤں کا جن کی تصریح قرآن کریم نے ان الفاظ میں کر دی کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ

اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (9/34)

اے جماعتِ مومنین! (ان مذہبی عالموں اور روحانی پیشواؤں سے ہوشیار رہو) یہ الاماشاء اللہ، وہ لوگ ہیں جو دوسروں کا مال باطل طریق پر کھا جاتے ہیں۔ عوام بچارے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف دعوت دینے والے لوگ ہیں۔ حالانکہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کی راہ کی طرف آنے نہ پائیں، کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت ختم ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت آگے چل کر یوں کر دی کہ

ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے خودساختہ مسلک کو شریعتِ خداوندی کا نام دے کر، لوگوں کو خدا کے سیدھے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے صاف اور سیدھے راستے میں خواہ مخواہ پیچ و خم پیدا کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات اور حیاتِ آخرت پر ان کا ایمان ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے مذہب کو محض بطور پیشہ اختیار کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ وہ ظالم ہیں جن پر خدا کی لعنت برستی ہے۔ (11/19-17)

اس طرح یہ لوگ دین میں اختلافات پیدا کر کے، امت کو فرقوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہ وہ ظلم ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ سورۃ زخرف میں (حضرت عیسےٰؑ کے ضمن میں) ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ
يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۔ (43/65)

ان میں مختلف گروہوں نے باہمی اختلاف پیدا کر لیا۔ سو جو لوگ اس طرح ظالم بن جائیں ان کے لئے الم انگیز تباہی کا عذاب ہوتا ہے۔

عام جرائم

یہ ظلم کی موٹی موٹی شقیں ہیں۔ ان کے علاوہ، قرآن کریم نے عام قوانین کی خلاف ورزی کو بھی (جسے جرائم سے تعبیر کیا جاتا ہے) ظلم کہہ کر پکارا ہے۔ مثلاً ان لوگوں کو جو میدانِ جنگ میں دغا دیں، ظالمین کہا ہے۔ (3/127)، چوری کے جرم کو بھی ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے (5/39)۔ حتیٰ کہ ہر قسم کی لغزش کو بھی (4/42) ان لغزشوں میں، معاشرتی زندگی کی وہ برائیاں بھی شامل ہیں، جو غلط معاشرہ میں اس قدر عام ہو جاتی ہیں کہ انہیں پھر برائیاں سمجھا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً سورۃ حجرات میں ہے۔

اے جماعتِ مومنین! یاد رکھو۔ ایسا کبھی نہ ہو کہ تم میں سے ایک فریق، دوسرے فریق کا

مذاق اڑانے لگ جائے اور اُسے ذلیل اور حقیر کرنے کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ تم سے بہتر ہی ہوں ۔۔۔ نہ تمہارے مرد یہ کچھ کریں نہ عورتیں۔ نہ ہی تم ایک دوسرے کے خلاف عیب لگاؤ (بہتان تراشی کرو) نہ طعن و تشنیع کرو۔ نہ ایک دوسرے کے اُلٹے پلٹے نام رکھو۔ جب تم ایمان لاکر بلند اخلاق کے حامل بننے کا تہیہ کر چکے ہو تو پھر آپس میں ایک دوسرے کے بُرے نام رکھنے کا کیا مطلب ؟ یہ بُری بات ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے اپنے کئے پر نادم ہو کر فوراً اس روش کو چھوڑ دینا چاہیئے اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا شمار ظالمین میں ہو جائے گا۔ (۴۹/۱۱)

اس سے اگلی آیت میں یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ حسنِ ظن سے کام لو اور بدگمانی سے بچو۔ نہ ہی کسی کی راز کی باتوں کی ٹوہ میں لگے رہو، نہ ہی ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ یہ سب برائیاں ایسی ہیں جو ظلم کی شق میں آجاتی ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی کا مذاق اڑائیں اور انہیں (SERIOUSLY) نہ لیں، انہیں بھی ظالم قرار دیا گیا ہے۔ اور ان سے کنارہ کش رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (۶/۶۸)

عدالتی نظام میں، مجرم کو اس کے جرم سے زیادہ سزا دینا بھی ظلم ہے۔ (۶/۱۶۰)

ظُلم اور ہم

یہ ہیں ظلم کی نوعیتیں جو قرآن کریم کے مختلف مقامات میں بیان ہوئی ہیں۔ آپ انہیں سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ ان میں سے کوئی شق بھی ایسی ہے جو ہمارے معاشرہ میں (نہ صرف یہ کہ پائی نہ جاتی ہو بلکہ) عام نہ ہو چکی ہو! اس حقیقت کو سامنے رکھئے اور پھر قرآن کریم کے ان حتمی اور یقینی اعلانات کو سامنے لائیے، جنہیں اس نے اپنے غیر متبدل قوانین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یعنے یہ کہ

ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ (۶/۲۱)

ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ (۲۸/۳۷)

ظالم قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ (۶/۴۷)

وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتی ہے (۶/۴۴)

اس کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے اور انسانیت اس پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ (۶/۴۵)

قرآن کریم نے یہ اصول اور قانون بیان کیا اور اس کی صداقت کی شہادت میں، وہ اقوام سابقہ کی

سرگذشتوں کو سامنے لایا۔ اس نے، قوم نوح ، قوم عاد ، قوم ثمود ، قوم مدین ، قوم لوط ، قوم فرعون غرضیکہ تمام اقوام سابقہ کی تاریخ پیش کی ہے اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ جب ان کے معاشرہ میں ظلم عام ہوگیا تو وہ تباہ ہوگئیں۔ وہ ان کے انفرادی تذکرہ کے بعد، بہیئت مجموعی کہتا ہے کہ۔

یہ اقوام گذشتہ میں سے چند ایک کی سرگزشت ہے، جسے ہم تم سے بیان کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض آبادیاں تو ابھی تک موجود ہیں اور باقی اجڑ چکی ہیں۔

تم نے ان کے حالات سے دیکھ لیا ہوگا کہ ہم نے ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی۔ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر زیادتی کی تھی۔ سو جب ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آگیا تو وہ جن غیر خداوندی قوتوں کے احکام کی اطاعت کیا کرتے تھے اور انہیں اپنا خدا سمجھے بیٹھے تھے، وہ ان کے کسی کام بھی نہ آسکیں۔ ان کی اطاعت اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی کہ وہ الٹا ان کی تباہی کا موجب بن جائے۔

لہذا، تاریخ کے ان نوشتوں سے تم اس محکم اصول کو یاد رکھو، کہ جب بھی کسی قوم میں ظلم عام ہو جائے تو وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت میں آجاتی ہے اور یہ گرفت بڑی سخت اور الم انگیز ہوتی ہے۔

اقوام گزشتہ کی ان داستانوں اور قانونِ مکافات کے اس غیر متبدل اصول میں اس قوم کے لئے واضح دلائل ہیں جو مستقبل کی تباہیوں کے احساس سے خائف رہتی ہے اور اس سے بچنا چاہتی ہے۔ (۱۱/۱۰۳-۱۰۰)

اس میں دوسروں کے لئے سامانِ عبرت اس لئے ہے کہ یہ محض اقوامِ سابقہ کے کوائف اور اخبار (CHRONICLES) نہیں جنہیں اساطیر الاولین (پرانے زمانے کے لوگوں کی کہانیاں) سمجھ کر پڑھ لیا جائے۔ یہ تو خدا کے اس قانون کی زندہ شہادات ہیں کہ جس قوم نے بھی ظلم کی روش اختیار کی اس کا انجام یہ ہوا۔ اس لئے جو قوم بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گی اس کا انجام اسی قسم کا ہوگا۔

فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ ۔ (۵۱/۵۹)

ہر زمانے کے ظالمین کا انجام وہی ہوگا جو ان سے پہلے زمانے کے ظالمین کا ہوا تھا۔

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ (۳۴/۱۹)۔ وہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی صرف داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔

وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۔ (۳۴/۱۹) ان کی اجتماعی حیثیت فنا ہو جاتی ہے اور ان کے افراد ادھر ادھر بکھرے ہوئے باقی رہ جاتے ہیں جو اپنی مٹی ہوئی عظمت کی عبرت ناک یادگار ہوتے ہیں اور اپنے ماضی کی

لاشوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے دربدر مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اقوام سابقہ کی ان داستانوں کے بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہی ہے۔ وہ ہر داستان کے بعد ہم سے کہتا ہے کہ

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ (۱۰/۳۹)

دیکھو! ظالمین کا انجام کیسا ہوا؟

وہ کہتا ہے کہ تم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب نہ دے لینا کہ وہ قومیں کمزور تھیں۔ انہوں نے اپنے وسائل پیداوار کو ترقی دے کر، ان سے کماحقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا تھا، اس لئے وہ تباہ ہوگئیں۔ یہ خیال غلط ہے۔

> وہ قومیں شان و شوکت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں، انہوں نے زمین کے سینے کو چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں کو باہر نکالا۔ ملکوں کو آباد کیا۔ اُن کی آبادیاں، اِن کی آبادیوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تباہ ہوگئیں۔ اس لئے نہیں کہ خدا نے انہیں یونہی ظلم و تعدی سے تباہ کر دیا۔ خدا کبھی ایسا نہیں کرتا۔ وہ تباہ اس لئے ہوئیں کہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔ (۳۰/۹)

نہ ہی یہ تھا کہ وہ کوئی جاہل، وحشی، یا غیر مہذب قومیں تھیں جو امور سیاست سے بے بہرہ اور علم و بصیرت سے بیگانہ تھیں۔ بالکل نہیں۔

> وہ غیر مہذب اور وحشی قومیں نہیں تھیں۔ انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع ــ سماعت، بصارت اور قلب ــ حاصل تھے۔ لیکن چونکہ ان کی روش ظالمانہ تھی اس لئے ان کی عقل و فراست اور فہم و فراست ان کے کسی کام نہ آئی اور جس انجام کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ تباہ ہوگئیں۔ (۴۶/۲۶)

اپنے آپ پر ظلم

ہم نے اوپر (آیت ۳۰/۹) دیکھا ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ان تباہ ہونے والی قوموں پر خدا نے ظلم و زیادتی نہیں کی تھی۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر زیادتی کی تھی" (وَلَٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ) قرآن کریم نے یہ اصطلاح، ظلم کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر استعمال کی ہے اور یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن سادہ سے انداز میں پیش کرتا ہے۔ ظالم سمجھتا یہ ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچا رہا ہے لیکن اگر وہ ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھے تو اُسے نظر آجائے کہ وہ کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا رہا بلکہ خود اپنی ذات کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ وہ بزعم خویش دوسروں کو تباہ کرتا ہے لیکن درحقیقت اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہوتا ہے۔

بالا دست قوم، کمزور قوموں کو کچلتی ہے اور اس میں بڑی لذت محسوس کرتی ہے لیکن اس ظلم و تعدی سے وہ درحقیقت خود اپنی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر تباہ ہونے والی قوم کی داستانِ عبرت و موعظت بیان کرنے کے بعد، واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ۔ (۱۱/۱۰۱)

ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ تباہ ہو گئے۔

تباہی کہاں سے آتی ہے؟

یہ قومیں عقل و شعور کی مالک ہوتی ہیں۔ اس لئے اپنی طرف سے پورا پورا انتظام کر لیتی ہیں کہ ان پر کہیں سے تباہی نہ آنے پائے۔ وہ سیاسی تدبّر کی فسوں سازیوں سے، وہ تمام راستے بند کر لیتی ہیں جن سے وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی تباہی کے اسباب اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ ہر ممکن خطرہ کی روک تھام کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ، ہر سر اٹھانے والے کا سر، قبل اس کے کہ وہ سر اٹھائے، کچل کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ اپنی طرف سے اپنی حفاظت کا سارا اہتمام کر لیتی ہیں۔ وہ اپنی سیاست کے محکم قلعوں میں (بزعمِ خویش) مصئون و مامون ہو کر بیٹھ جاتی ہیں، لیکن نہیں سمجھتیں کہ ان قلعوں کی بنیادوں میں خرابی کی ایک صورت مضمر ہے جو اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جا رہی ہے۔ چنانچہ اُن کی اِن تمام تدابیر کے علی الرغم، ان پر تباہی کا عذاب ان راستوں سے آجاتا ہے جو اُن کی عقل و شعور تک میں نہیں ہوتے۔ قرآن کے الفاظ میں:۔

> جو کچھ یہ کر رہے ہیں، کوئی نئی بات نہیں۔ ان سے پہلی قوموں نے بھی اِسی قسم کی ڈپلومیٹک تدابیر اختیار کر رکھی تھیں کہ کوئی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے نہ پائے۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافات نے ان کے نظامِ تمدن کی بنیادوں تک کو ہلا دیا۔ اور اُس کی چھتیں ان کے اوپر آگریں۔ انہوں نے اپنی طرف سے تباہی کے ہر راستے بند کر رکھے تھے۔ لیکن تباہی ان پر ان راستوں سے آپہنچی جو ان کی عقل و شعور تک میں نہ تھے۔
>
> (۱۶/۲۶)

تباہی کی شکلیں

یہ تباہی کن شکلوں میں آتی ہے۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقہ میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے تو وہ

تباہی مچا دیتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیاں بنا لیتے ہیں، اور ایک دوسرے سے لڑکر تباہ ہو جاتے ہیں۔ (۶/۷۵)

لیکن ظالم قوم کی تباہی کی مؤثر ترین صورت وہ ہے جس میں مظلوم، قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے اندر نظم وضبط پیدا کر کے، ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ہر ظالم کو نظر آ جاتا ہے کہ اس کا صحیح مقام کون سا ہے۔ قرآن کریم نے (سورۂ شعراء میں) زندگی سے شاعری کرنے والی جماعتوں کے مقابلہ میں قوم مومنین کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے۔

ان کے برعکس، وحی پر ایمان لانے والے ہیں جو ایک متعین نصب العین پر یقین رکھتے ہیں اور ایسے پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں جو ان کی اپنی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما کرے، اور دُنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں۔ اُسے کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ جب ان پر کوئی ظلم وزیادتی کرتا ہے تو وہ شاعروں کی طرح اس کی ہجو لکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہیں کر لیتے بلکہ اس سے اس ظلم وزیادتی کا بدلہ لیتے ہیں اور ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ظلم وزیادتی کرنے والے بدلگام نہ پھرتے رہیں بلکہ انہیں نظر آ جائے کہ ان کا صحیح مقام کون سا ہے جس کی طرف انہیں لوٹا کر لایا جائے گا۔ اس کو انقلاب کہا جاتا ہے۔ (۲۶/۲۲۷)

قوموں کی تباہی سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ ان کا کوئی فرد باقی نہیں رہتا۔ اس سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ان کی شان وشوکت، قوت وثروت، عزت وعظمت، حکومت وسطوت چھن جاتی ہے اور وہ دنیا میں ذلت وخواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا.... (۳۹/۲۶)

ان کے ظلم کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں اسی دنیا میں ذلت وخواری کی زندگی بسر کرنی پڑی (اور مستقبل کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہوگا)

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) — ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا یعنے وہ اپنی روٹی تک کے لئے دوسری قوموں کے محتاج ہو گئے۔ اور انہیں اپنی ملی ہستی کی حفاظت کے لئے ہر وقت دھڑکا لگا رہا۔ یہ ہیں قوموں کی تباہی کی علامات۔ سورہ طٰہٰ میں قرآنِ کریم نے اسے ایک ایسے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے اجمال میں ہزار تفاصیل پوشیدہ

ہیں۔ کہا۔ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا (۲۰/۱۱۱) ــــ اَلْغَیَابُ اس چقماق کو کہتے ہیں جس سے آگ کی چنگاری نہ نکلے۔ یعنی ظلم کرنے والی قوموں کی کیفیت اس چقماق کی سی ہو جاتی ہے جس کی شکل وصورت تو ویسے کی ویسی ہی رہے لیکن اس میں زندگی بخش حرارت باقی نہ رہے۔ وہ شعلۂ افسردہ کی طرح ہو جائے۔ یہ ہے ہلاک شدہ قوموں کا عبرت انگیز مرقع۔

مُہلت کا وقفہ

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ ظالم پنپ نہیں سکتا۔ لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ظالم دن رات پنپتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا ہر پروگرام کامیاب ہوتا ہے۔ وہ کھلے بندوں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ افراد کا بھی یہی حال ہے اور اقوام کی بھی یہی کیفیت۔ جو قوم قوت فراہم کرلے، وہ دوسری قوموں کے خلاف جو جی میں آئے کرے، اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ مظلوم اور کمزور پستے چلے جاتے ہیں۔ اور ظالم اور قاہر بپھرے پھرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری نگاہ کی کمزوری ہے جو صرف چند قدموں تک دیکھ سکتی ہے، اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ اگر تمہاری حدِ نگاہ وسیع ہوتی تو تم دیکھ لیتے کہ ظالم، انجامِ کار، تباہ و برباد ہو جاتا ہے بات یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس شکل میں سامنے آنے میں ایک مُدت ہوتی ہے، جسے مُہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ محسوس شکل میں ایک مُدت کے بعد جا کر سامنے آتا ہے۔ تمہاری نگاہ اس "مُہلت کے وقفہ" میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور تم خیال کر لیتے ہو کہ ظلم نتیجہ خیز ہو ہی نہیں رہا۔ بس یہ ہے تمہاری بھول۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

> تم اس کا وہم و گمان تک بھی نہ کرو کہ یہ ظالم اور سرکش لوگ جو کچھ کر رہے ہیں ہم اس سے بے خبر ہیں۔ ہمارا قانونِ مکافات سب کچھ دیکھ رہا ہے لیکن یہ وقفہ مہلت کا ہے۔ جب ظہورِ نتائج کا وقت آجائے گا، اس وقت تباہیوں کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ افراتفری کا یہ عالم ہوگا کہ یہ ادھر ادھر دیکھے بغیر، منہ اٹھائے، بدحواس بھاگے چلے جائیں گے۔ سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ حتےٰ کہ ان کی نگاہ بھی کاشانۂ چشم میں لوٹ کر

نہیں آئے گی۔ ان کے دل امیدوں سے خالی ہو جائینگے۔ یاس انگیز تاریکیاں اُن پر بُری طرح چھا جائیں گی۔ (۱۴/۴۴)

دوسرے مقام پر اس قانونِ تدریج و امہال کی حکمت بھی بیان کر دی ہے۔ جہاں کہا ہے کہ:۔

اگر کائنات کے ارتقاء میں تدریجی قانون کارفرما نہ ہوتا، اور خدا کا قانونِ مکافات لوگوں کے ظلم و زیادتی پر اُن کی فوری گرفت کر لیا کرتا، تو صفحۂ ارض پر کوئی چلنے والا انسان نظر نہ آتا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ انہیں مقررہ تاریخی منازل تک پہنچانے کے لئے ان کے انجام کو مؤخر کرتا جاتا ہے اور جب وہ اپنے مستقر تک پہنچ جاتے ہیں تو اس کے بعد نہ ایک ثانیہ کی دیر ہوتی ہے، نہ سویر۔ ان کے اعمال کا آخری فیصلہ کن نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔ (۱۶/۶۱)

اسی کو قرآن نے "پلڑا جھکنے" (ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ) سے تعبیر کیا ہے۔ قوموں کو سرفرازی اُسوقت نصیب ہوتی ہے جب ان کے تعمیری کاموں کا پلڑا جھکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کی تخریبی کارفرمائیاں شروع ہو جاتی ہیں تو تعمیری پلڑا آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں اگر وہ اپنی اصلاح کر لیں اور تعمیری کاموں کے وزن میں اضافہ کر لیں تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہیں۔ (مہلت کے وقفہ سے ماحصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہلاکت سے پہلے، بازآفرینی کا موقعہ بہم پہنچایا جاتے) لیکن اگر وہ اپنی روش سے باز نہیں آتیں، تو تخریبی پلڑا بھاری ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جب وہ تعمیری پلڑے کے مقابلہ میں، زیادہ جھک جاتا ہے، تو قوم پر تباہی آجاتی ہے۔ اُس وقت بازیابی کا موقعہ باقی نہیں رہتا۔ تباہی کے اس طرح محسوس شکل میں سامنے آنے سے، انہیں خدا کے قانونِ مکافات کی صداقت کا یقین آجاتا ہے لیکن اُسوقت یہ احساس و یقین انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ دیکھئے سورۃ مومن میں اس حقیقت کو کسقدر واشگاف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

اگر یہ لوگ اس امر کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں کہ ظلم و تعدی سے قومیں کسطرح تباہ ہؤا کرتی ہیں، تو ان سے کہو کہ ذرا دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو قومیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں، ان کا انجام کیا ہؤا۔ وہ تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھے اور قوت میں بھی ان سے بڑھ چڑھ کر۔ انہوں نے زمین سے پیدا ہونے والے سامانِ زیست پر بھی ان سے کہیں زیادہ تصرف حاصل کر رکھا تھا۔ لیکن ان کا مال و دولت اور ان کی ہنرمندی وکاریگری، انہیں ان کے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے بالکل نہ بچا سکے۔ وہ

سب دھرے کا دھرا رہ گیا۔

جب ان کے رسول ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے ان کی تکذیب کی، اور اپنے علم و ہنر پر نازاں رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں آدبوچا۔

جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو چلا اٹھے اور کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن قوتوں کو ہم اسکے شریک سمجھتے تھے، ان سے انکار کرتے ہیں۔

لیکن اس ایمان نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا جسے وہ عذاب کو دیکھ کر لائے تھے۔ ایمان وہی نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے جو ظہور نتائج سے پہلے لایا جائے کیونکہ اس صورت میں ہنوز وقت ہوتا ہے کہ انسان، تعمیری کاموں سے، سابقہ تخریبی اعمال کے مضر اثرات کا ازالہ کر سکے۔ (۹۰/۸۲-۸۵)

اور اس کے بعد ہے:

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ۔ (۴۰/۸۵)

یہ خدا کا وہ قانون ہے جو انسانوں پر شروع سے نافذ ہوتا چلا آرہا ہے۔

اُس وقت نہ تو ان کا ایمان کچھ کام دے سکے گا اور نہ ہی ان کا چیخنا چلانا کچھ کفایت کر سکیگا۔ یہ مدد کے لئے چیخیں چلائینگے، اور کہینگے کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ایکبار یہاں سے نکالدے، پھر دیکھ کہ ہم کسطرح اپنی سابقہ روش کے خلاف، تیرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اچھے کام کرتے ہیں۔

ان سے کہا جائیگا کہ کیا تمہیں اتنی عمر نہیں دی گئی تھی کہ تم میں سے جو ہمارے قانون کے مطابق نصیحت حاصل کرنا چاہتا وہ اس کے لئے کافی ہو جاتی؟ اور پھر تمہارے پاس وہ پیغامبر بھی آگیا تھا جو تم سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ تمہاری روش تمہیں تباہی کے جہنم کی طرف لے جائیگی۔ لیکن تم نے اس کی ایک نہ مانی۔ سو اب تم اپنے اعمال کے نتائج بھگتو۔ اب کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ظلم کرنے والوں کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔ (۳۵/۳۷)

کارگہِ کائنات کیوں سرگرمِ عمل ہے؟

ہمارے سامنے لوگوں کے غلط اعمال کی سزا کیلئے

دنیا کا عدالتی نظام ہی ہوتا ہے جو ناقص بھی ہو سکتا ہے اور خائن (بددیانت) بھی۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ظلم کرنے والے دندناتے پھرتے اور دن بدن پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں، اور انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہیں، تو یہ دنیاوی نظامِ عدل کا نقص ہے۔ لیکن خدا نے جب کہا ہے کہ "ظالم بچ نہیں سکتا" تو وہ اس کے لئے ہمارے نظامِ عدل کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کا ایک اپنا نظام ہے جو نہ ناقص ہو سکتا ہے نہ خائن۔ اس کی نتیجہ خیزی اٹل ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات اسی نظامِ عدل کو قائم رکھنے کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۔ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ (۴۵/۲۲)

اس لئے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ (نیز ۴۲/۱۹ ؛ ۴/۱۲۴ ؛ ۱۹/۴۰)

"کسی پر کسی قسم کا ظلم و زیادتی نہ ہو" — یہ ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات — اسی کا نام خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے، جسے عوام کی زبان میں "خدا کی چکی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ چکی پیستی تو بے شک بہت باریک ہے لیکن اس کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کے مطابق) بہت سست ہوتی ہے اور مظلوم کی یہ انتہائی آرزو ہوتی ہے کہ وہ ظالم کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

یہ تجھ سے کہتے ہیں کہ وہ تباہی جلد آنی چاہیئے — وہ تباہی ضرور آئے گی۔ خدا کا قانون اٹل ہے۔ لیکن اس کی رفتار بڑی سست ہے۔ خدا کا ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ (۲۲/۴۷)

اب اس کا کیا کیا جائے؟ مظلوم کے دل کی پکار رہ رہ کر کہتی ہے کہ ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یہ ہے "بیتابیٔ تمنا اور صبر طلبیٔ عشق"[1] کی وہ کشمکش، جس کے حل کے لئے قرآن چاہتا ہے کہ دنیا میں خود دانائوں کے ہاتھوں ایک ایسا نظام قائم ہو جو لوگوں کے اعمال کی نتیجہ براری میں تو نظامِ کائنات کے مماثل ہو، لیکن اس کی رفتار اتنی سست نہ ہو۔ اس کا نام دین کا نظام، یا اسلامی مملکت ہے جس

---

[1] عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب ؛ دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک (غالبؔ)

کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ ۔ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ ہر متنفس کو اسکے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملجائے، اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو؛ اس نظام کو سب سے پہلے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ خدا کا وہی دن، جو نظامِ کائنات میں ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے، اس نظام میں کس طرح چوبیس گھنٹے کا بن جاتا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو دنیا کے کسی جابر اور ظالم سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس نظام کے داعی کو آگاہ کر دیا گیا کہ یاد رکھو۔

یہ لوگ چاہیں گے کہ اگر تم تھوڑا سا اُن کی طرف جھک جاؤ تو یہ تمہاری طرف جھک جائیں۔ دیکھنا، ایسا نہ کرنا ۔ (۶۸/۹)

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۔ (۱۱/۱۳) ۔ اگر تم ذرا بھی ان کی طرف جھک گئے اور اس طرح ان سے مفاہمت کر لی، تو یاد رکھو تم بھی اسی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں ۔ تمہارا نظام، عدل پر مبنی ہے اور عدل اگر ذرا سا بھی ظلم کیطرف مائل ہو جائے تو وہ عدل نہیں رہتا، ظلم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے مفاہمت کی کوشش کی، تو اس نظام کے داعیٔ برحق نے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میں قوانینِ خداوندی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ میں تو خود انہی کا اتباع کرتا ہوں۔

اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو مجھے اسکے نتیجے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی اسی عذاب کی لپیٹ میں آ جاؤں گا۔

یہ تھا وہ نظام، جس کے متعلق اعلان کر دیا کہ یاد رکھو:۔

اس میں کوئی شخص کسی کے جرم کا ذرا سا بھی بوجھ نہیں بٹا سکے گا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا خود بھگتنی پڑے گی۔ نہ ہی کسی کی شفاعت کسی کے کام آسکے گی، نہ ہی کسی سے اس کے جرم کے معاوضہ میں کچھ رشوت لے کر اُسے چھوڑ دیا جائیگا، نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کا حمائتی بن سکے گا۔ (۲/۴۸)

دنیا کے نظامِ عدل کی رُو سے، اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ مروجہ قانون کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہو جائے تو عدل کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے لیکن قرآن کریم اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلہ عدل کہلائے گا لیکن اگر خود وہ قانون ہی ظلم اور ناانصافی پر مبنی ہو تو اسکے مطابق فیصلہ کس طرح مبنی بر عدل قرار پا سکتا ہے؟ لہٰذا، وہ اس نظام کے متعلق جس کا ذکر اوپر کیا گیا

ہے کہتا ہے کہ اس میں قانون سازی کا اختیار انسانوں کو حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اصولی طور پر قوانین خدا کے نازل کردہ ہوتے ہیں اور وہ نظام ان کے مطابق فیصلے کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

يَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۔ (۷/۱۵۹)

یہ لوگ دوسروں کو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے وہ لوگ ظالم ہیں جو "مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ" کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ (۵/۴۵)

بازنجوشتن نگر

ظلم کی مختلف نوعیتیں جنہیں قرآنِ کریم نے اس شرح وبسط سے بیان کیا ہے، ہمارے سامنے آگئیں۔ آپ انہیں دیکھئے اور سوچئے کہ ان میں سے کوئی شق بھی ایسی ہے جو آج ہمارے معاشرے میں نہ پائی جاتی ہو؟ آپ دیکھیں گے کہ ظلم کی ان شقوں کا ہمارے ہاں پایا جانا تو ایک طرف، یہ ہمارے معاشرہ کا معمول بن چکی ہیں اور اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ ان سے اب ہمارے دل میں کھٹک تک پیدا نہیں ہوتی — اگر کھٹک پیدا ہوتی ہے تو صرف اس وقت جب کوئی دوسرا ہم پر زیادتی کرے۔

اس کے بعد آپ پھر وہیں چلے چلئے جہاں سے بات شروع کی گئی تھی۔ یعنے ایک ذہنیت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ ظالم پنپ نہیں سکتا۔ ظلم کا انجام تباہی ہوتا ہے، کمزوروں اور ناتوانوں کی خود فریبی ہے جو فرد یا قوم، قوت حاصل کر کے اپنی مدافعت کا سامان مہیا کر لیتی ہے، اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دنیا کا یہی چلن رہا ہے، یہی چلن رہے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں سارا زور اپنی قوت اور مدافعت کا سامان مہیا کرنے پر دیا جائے گا۔ ظلم و جور سے رُکنے کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوگا۔

دوسری ذہنیت یہ ہے کہ خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور جس معاشرہ میں ظلم کا چلن عام ہو، وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ خواہ اس نے اپنی حفاظت اور مدافعت کے کتنے ہی انتظامات کیوں نہ کر رکھے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں، ساری کوشش ظلم سے رُکنے کی کی جائے گی۔

اول الذکر ذہنیت کا نام خدا سے انکار (کفر) ہے۔ اور دوسری کو خدا پر ایمان (اسلام) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ ہمارا شمار کس زمرے میں ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اسے بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے، کہ قانونِ خداوندی کے اٹل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اگر آپ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ اپنا نتیجہ پیدا کرے گا۔ اور اگر آپ اسے صحیح تسلیم نہیں کرتے تو وہ معطل ہو جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ وہ قانون بہرحال اور بہرحیثیت اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہے گا خواہ آپ اسے صحیح مانیں یا نہ مانیں۔ سنکھیا بہرحال مہلک ہے، خواہ آپ اس کی ہلاکت آفرینی کو صحیح تسلیم کریں یا جھوٹ سمجھیں ـــــ اور سنکھیا اُس شخص کو بھی اسی طرح ہلاک کرے گا جو زبان سے اس کی ہلاکت آفرینی کا اقرار کرے لیکن پھر بھی اُسے پھانک لے، جسطرح اس شخص کو ہلاک کر دے گا جو اس کی ہلاکت آفرینی کا کھلے بندوں انکار کرتا ہوا اُسے چاٹ لے لہٰذا، اگر خدا کا یہ قانون اٹل ہے ـــــ اور اس کے اٹل ہونے میں شبہ ہی کیا ہے ـــــ کہ جس قوم میں ظلم عام ہو جائے وہ تباہ ہو جاتی ہے) اور ہماری روش یہی رہی، تو "پاکستان زندہ باد" کے ہزار نعروں، اور "ملتِ اسلامیہ پائندہ باد" کی لاکھ تمناؤں کے باوجود، ہم تباہی سے بچ نہیں سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بیرونی خطرات سے ملک کی حفاظت کا انتظام نہایت ضروری ہے، اور ایسا انتظام ضرور کرنا چاہیئے اور ملک کے ہر باشندے کو اس میں پورا پورا حصہ لینا چاہیئے (کہ اپنی سرحدوں کو مضبوط و مستحکم رکھنے کا حکم بھی خداوندی ہے) اس میں بھی کلام نہیں کہ ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے مادی ترقی بھی نہایت ضروری ہے (کہ بھوک کو خداوندِ کریم نے خدا کا عذاب قرار دیا ہے) لیکن، ان تمام انتظامات و اہتمامات کے باوجود، ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہم نے اپنے معاشرہ میں ظلم کی بڑھتی ہوئی رَو کو نہ روکا، تو یہ انتظامات و اہتمامات ہمیں تباہی سے کبھی نہیں بچا سکیں گے، نہ ہی ہماری مروجہ نمازیں اور ہمارے روزے، ہمارا حج اور ہماری زکوٰۃ، ہماری نذریں اور ہماری نیازیں، ہمارے وعظ اور ہمارے خطبے، ہمیں اس تباہی سے محفوظ رکھ سکیں گے کہ خدا نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ظالم قوم کی رسمی مذہب پرستی اسے ظلم کی آوردہ تباہی سے بچا لے گی۔

جب ہم ظلم کا لفظ زبان پر لاتے ہیں تو ہماری نگاہیں ہمیشہ عمالِ حکومت اور اربابِ نظم و نسق کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ اور ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ظلم ان کی طرف سے ہوتا ہے ہم اس کے مجرم نہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ظلم کی جن نوعیتوں کا ذکر کیا ہے، انہیں ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے اور دیکھئے کہ ان میں سے کتنی شقیں ایسی ہیں جن کے مرتکب ہم خود ہوتے ہیں۔ لہٰذا، جس معاشرہ میں قرآنی تصور کے مطابق ظلم کا دور دورہ ہو، اس میں ظلم کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں ہوتا۔ اسکے جراثیم سارے جسدِ معاشرہ میں حلول کئے ہوتے ہیں۔

لیکن اگر یہ تصور بھی کر لیا جائے کہ ظلم کسی خاص طبقے کی طرف سے ہوتا ہے، ہم اس کے مرتکب نہیں ہیں

تو اس کے یہ معنے نہیں کہ ظلم کی وجہ سے جب معاشرہ پر تباہی آئے گی تو وہ چُن چُن کر ان افراد کو گھیر لے گی جو ظلم کے مرتکب ہوتے تھے اور ہمیں چھوڑتی جائے گی۔ قطعاً نہیں۔ جب قوموں پر تباہی آتی ہے تو پھر ——— نہ کِہ را منزلت باشد نہ مِہ را ——— اس سے ساری کی ساری قوم تباہ ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (۸/۲۵)

اس تباہی سے اپنے آپ کو (قبل از وقت) بچاؤ کہ جب وہ آتی ہے تو پھر انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظلم کیا تھا۔

جب کسی ناعاقبت اندیش کے کشتی میں چھید کر دینے سے کشتی میں پانی بھر جاتا ہے، تو اس سے صرف وہی شخص نہیں ڈوبا کرتا جس نے کشتی میں چھید کیا تھا۔ کشتی کے تمام مسافر ڈوب جایا کرتے ہیں۔

وہ ہے خدا کا قانون، اور یہ ہے ہمارے معاشرہ کی موجودہ حالت۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ابھی اس مہلت کے وقفہ سے گذر رہے ہیں جو تباہی سے پہلے آتا ہے۔ اگر ہم اب بھی سنبھل جائیں تو ہمارے بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم نے اس وقفہ سے فائدہ نہ اٹھایا اور اسی رفتار سے آگے بڑھتے گئے، تو پھر خدا کا اٹل قانون اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے گا اور ہمارا حشر بھی انہیں قوموں جیسا ہو جائے گا جن کے متعلق کہا ہے کہ:

وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ——— وہ قوم تباہ ہو گئی اور ہم نے کسی دوسری قوم کو اس کا وارث بنا دیا۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ ——— پھر ان کی تباہی پر نہ آسمان نے آنسو بہائے نہ زمین کی آنکھ نم آلود ہوئی۔

وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ۔ (۴۴/۲۸-۲۹) ——— اور نہ ہی انہیں اس کی مہلت دی گئی کہ اپنے بچاؤ کا سامان کر سکیں۔

لہٰذا ———

"حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں"

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

محکمہ اوقاف نے صوفیائے کرام کی سوانح اور تاریخ اسلام سے متعلق قلمی مخطوطات اور نایاب کتب کی اشاعت کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت سولہ کتابیں شائع کی جائیں گی۔ حکومت نے گزشتہ دو سالوں میں اس منصوبے کے لئے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے　　(بحوالہ مشرق ۱۴ ۹/۶۶)

ان کتب نایاب کی اشاعت میں بہرحال کچھ وقت لگیگا۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ اپنے قارئین کو اتنے طویل وقت تک کے لئے وقفِ انتظار رکھیں۔ ہم انہیں نمونۃً دکھا دینا چاہتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے متعلق جو کتابیں شائع ہوں گی ان میں کس قسم کے نوادرات آپ کے سامنے آئیں گے۔

ہندوستان (اور پاکستان) میں یوں تو تصوف کے متعدد خانوادے معروف ہیں لیکن ان سب میں زیادہ شہرت خاندان چشتیہ کے اولیاء کرام کو حاصل ہے۔ ان حضرات کے ملفوظات چھپ چکے ہیں۔ اصل بھی اور ان کے تراجم بھی ـــ ہم ان میں سے بعض اقتباسات پیش قارئین کرتے ہیں۔ ان ملفوظات کی صورت یہ ہے کہ ایک بزرگ اپنی مجلس میں کچھ ارشاد فرماتے ہیں اور ان کے خلیفہ اسے قلمبند کر لیتے ہیں۔ مثلاً حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے پیرومرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونؒ تھے۔ انہوں نے (یعنی خواجہ اجمیریؒ نے) حضرت ہارونؒ کے ملفوظات مرتب فرمائے۔ اس مجموعہ کا نام ہے "انیس الارواح"۔ خواجہ اجمیریؒ کے ملفوظات کو ان کے خلیفہ خواجہ قطب الدین اوشی کاکیؒ نے قلمبند فرمایا۔ اس کا نام "دلیل العارفین" ہے خواجہ قطب عالم کے ملفوظات کو بابا فرید گنج شکرؒ نے جمع کیا۔ اس مجموعہ کا نام ہے "فوائد السالکین"۔ حضرت بابا فریدؒ کے ملفوظات کو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے مرتب فرمایا۔ اس کا نام "راحت القلوب" ہے۔ حضرت خواجہ

نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات کو امیر خسروؒ نے مرتب کیا۔ اس مجموعہ کا نام ہے "راحت المحبین"۔

آپ نے دیکھا کہ اس طرح ان مجموعوں کو تقدس کی دوہری سند عطا ہو جاتی ہے۔ ایک تو اتنے جلیل القدر بزرگ کے فرمودات کی حیثیت سے اور دوسرے اس قدر عظیم المرتبت بزرگ کی جمع و ترتیب کی حیثیت سے۔ اب یہ دیکھئے کہ ان ملفوظات میں کس قسم کی تعلیم منضبط ہے۔ غور سے دیکھئے :۔

انیسُ الارواح

پہلا مجموعہ ہے" اَنیسُ الاَرواح" یعنی خواجہ عثمانؒ ہارونی کے ارشادات کا مجموعہ۔ جسے خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے مرتب فرمایا۔ خواجہ صاحب اپنے پیرو مرشد کے متعلق فرماتے ہیں کہ

" میرے ہمسایہ میں میرا ایک پیر بھائی تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا۔ لوگ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر دفن کر کے واپس چلے آئے۔ میں اس کی قبر پہ بیٹھا رہا۔ عالمِ مشغولی میں کیا دیکھتا ہوں کہ دو فرشتے عذاب کے اس کے پاس آئے اور چاہتے تھے کہ عذاب کریں۔ اتنے میں حضرت پیرو مرشد تشریف لائے اور ان دونوں فرشتوں کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ اسے عذاب مت کرو۔ یہ میرا مرید ہے۔ وہ حسب الارشاد واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے اور عرض کی، باری تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ اگرچہ یہ شخص آپ کا مرید تھا لیکن آپ کے طریقے سے برگشتہ تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ حال ایسا ہی ہے مگر اس نے اپنی ذات کو میرے پلے میں باندھا تھا۔ اس کی حمایت میرے ذمہ ضروری ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ان فرشتوں کو حکم ہوا کہ واپس چلے آؤ۔ اس شخص کو عذاب نہ کرو۔ ہم نے اسے حضرت کی خاطر عزیز ہونے کے سبب سے بخش دیا ہے۔"

اس کے بعد خواجہ صاحب نے اپنے پیرو مرشد کی معیت میں ایک سفر کا حال لکھا ہے، جس میں (بدخشاں میں)، ایک بزرگ کو دیکھا جن کی عمر ایک سو چالیس برس کی تھی۔ ان کا ایک پاؤں جڑ سے کٹا ہوا تھا اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ :۔

" میں ایک مدت سے اس صومعہ میں معتکف ہوں۔ اس سے کبھی ایک قدم بھی خواہش نفس سے باہر نہیں نکالا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہوائے نفسانی سے یہ بریدہ پاؤں باہر نکالا۔ اور دوسرا نکال کر ارادہ روانگی رکھتا تھا کہ ہاتف نے آواز دی —— اے مدعی! ہمیں عہد بھلا کر فراموش کر دی! —— یہ آواز سن کر متنبہ ہوا اور اپنی وعدہ خلافی سے پشیمان، چھری میرے پاس موجود تھی۔ فی الفور میان سے نکالی اور اس پاؤں کو جو باہر نکالا تھا کاٹ کر پھینک دیا۔"

اب مجالس کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ ایک دن گفتگو درباره چاند و سورج گرہن ہوئی۔ آپ نے فرمایا۔

حضرت ابن عباسؓ نے رسول اللہ سے روایت کی ہے کہ جب آدمیوں سے گناہ زیادہ سرزد ہوتے ہیں، فرشتوں کو اللہ تعالےٰ حکم دے دیتا ہے کہ چاند اور سورج کو پکڑو اور اس کے کسی جزو کل کو کسی قدر عرصہ کے لئے بے نور کردو کہ اس سے خلق کو عبرت ہو۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ۔

"اگر خاوند کے جسم سے پیپ اور خون رواں ہو اور عورت اسے صاف کرنے کے لئے اپنے منہ سے چاٹے تو بھی خاوند کا حق کما حقہٗ ادا نہیں ہوگا۔"

ایک مجلس میں فرمایا۔ کہ

"حضرت عیسیٰؑ کا دسترخوان سُرخ رنگ کا تھا۔ وہ آسمان سے نازل ہوا تھا۔ جو شخص سُرخ دسترخوان پہ روٹی کھاتا ہے، بروز حشر حضرت جبریل اس کے لئے براق معہ حلہ بہشتی لائینگے۔"

ایک مجلس میں اہل جنت سے متعلق گفتگو ہوئی تو فرمایا۔ کہ

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ ہمیں اہل جنت کے خورد و پوش سے خبر دیجئے حضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے مجھ کو اس ذوالجلال والاکرام کی جس نے مجھے پیغمبری دی ہے کہ مرد بہشت میں سو مرتبہ کھانا کھائے گا اور سو ہی مرتبہ اپنی عیالداری سے محبت کرے گا۔ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب اس قدر کھانا پینا ہوگا تو انہیں قضائے حاجت بھی ہوگی یا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ وقت قضائے حاجت شکم سے ایک ریح خارج ہوگی جس کی خوشبو مشک کو ماند کرتی جائے گی۔"

دلیلُ العارفین

اب اس مجموعہ کو لو جو خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور جنہیں خواجہ قطب عالمؒ نے مرتب فرمایا تھا۔

آپ نے ایک مجلس میں فرمایا۔ کہ

"فقہ اکبر میں بروایت امام اعظم ابوحنیفہؒ لکھا ہے کہ ایک کفن چور جس نے چالیس سال تک کفن چرائے تھے، قضائے الٰہی سے مرگیا۔ اس کے بعد لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ بہشت بریں میں خراماں ہے پوچھا یہ درجہ اس نے کہاں سے حاصل کیا؟ جواب دیا کہ نماز پڑھنے اور صبح کی نماز سے اشراق تک مصلے پر قرار پکڑنے کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے میرے سارے گناہ بخش دیئے۔"

ایک مجلس میں فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ

ساھُون کی تفسیر میں فرمایا کہ ویل ایک کنواں یا میدان، دوزخ میں ہے۔ اس سے زیادہ کسی دوزخ میں عذاب نہیں۔

ایک مجلس میں عذاب قبر کے متعلق گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ

• ایک بزرگ بصرہ کے ایک قبرستان میں بیٹھے تھے۔ ہمارے متصل ایک مردے کو عذاب قبر ہو رہا تھا۔ اس بزرگ نے جب یہ حال دیکھا تو زور سے نعرہ مار کر زمین پر گر پڑے۔ ہم نے اٹھانا چاہا تو معلوم ہوا کہ جان قالب سے پرواز کر گئی ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں بدن ان کا پانی ہو کر ناپید ہو گیا۔ اسی طرح فرمایا۔ کہ دو درویش قوالی سنتے سنتے زمین پر گر پڑے۔ خرقہ ان کا زمین پر پڑا رہا اور جسم اس کے اندر سے غائب ہو گیا۔"

ایک مجلس میں خواجہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ

" بروز قیامت انبیاء، اولیاء سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ ان کے کندھوں پر کمبل پڑے ہونگے ہر ایک کمبل میں کم و بیش ایک لاکھ تانے کے تاگے، اور ایک لاکھ بانے کے ہونگے۔ ان کے مرید اور بچے ان کے ان تاگوں کو پکڑیں گے اور اس وقت تک پکڑے رہیں گے جب تک خلق ہنگامہ محشر سے فارغ نہ ہو۔ پھر حق تعالےٰ انہیں پل صراط پر پہنچائے گا اور وہ مع اپنے پیروں کے اس پنتیس ہزار برس کے راستوں کو ایک دم زدن میں بہ برکت پکڑے رہنے اس گلیم کے طے کریں گے اور دروازہ بہشت پر پہنچکر دارالنعیم میں داخل ہوں گے۔"

ایک اور مجلس میں فرمایا کہ۔

"جب رسول اللہ کا وصال ہوا تو آپ نے اصحاب کہف کا غار دیکھا۔ انہیں سلام کیا۔ حق تعالےٰ نے سب کو زندہ کیا اور جواب سلام دلوایا۔ آپ نے مذہب اسلام کی دعوت دی اور انہوں نے اسے بصدق دل منظور کیا۔"

ایک مجلس میں فرشتوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ۔

" اللہ تعالےٰ نے ایک فرشتہ ہابیل نام پیدا کیا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب میں، تسبیح اس فرشتہ کی ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ وہ روز و شب پر موکل ہے اس کے سامنے ایک تختی پر بہت سے خطوط سیاہ و سفید ہیں۔ وہ ان خطوط کی درازی اور کوتاہی سے رات

---

۱ تباہی (ویل) ہے ان نمازیوں کے لئے جن کی نمازیں تیر بے ہدف کی طرح بے نتیجہ رہ جائیں۔

دن چھوٹا بڑا کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو رات دن گھٹ بڑھ جاتے ہیں۔ یہ فرماکر آپ زار و قطار رونے لگے اور عالم بیہوشی آپ پر طاری ہوا۔ پھر فرمایا کہ حق تعالےٰ نے کوہ قاف کو پیدا کیا ہے اور تمام عالم اس کے احاطہ کے اندر آباد ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ فرمایا: ق۔ والقرآن المجید۔۔۔۔۔ پھر فرمایا کہ وہ پہاڑ زمین سے چالیس گنا زیادہ وسیع ہے۔ اسے ایک گائے اپنے سر پر رکھے ہوئے ہے۔ درازی اس گائے کی تیس ہزار سال کی راہ ہے۔ سر اس کا مشرق میں اور دم مغرب میں ہے۔ پھر فرمایا کہ خواجہ مودود چشتیؒ نے جس مجلس میں یہ بات بیان کی تھی اس میں ایک درویش حاضر تھے۔ انہیں اس سے اپنے دل میں کچھ شک گزرا حضرت خواجہ سر بمراقبہ ہوئے اور وہ اور وہ درویش اپنے خرقوں سے گم ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے تو اس درویش نے قسم کھا کر کہا کہ مجھے حضرت خواجہ نے کوہ قاف دکھا دیا ہے۔ اب مجھ کو کوئی شبہ نہیں رہا۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ۔

"جس روز اللہ تعالےٰ نے دوزخ کو پیدا کیا۔ اس روز اللہ تعالےٰ نے ایک سانپ کو بھی پیدا کیا اور اس سانپ سے ارشاد فرمایا کہ اے سانپ! ہم تجھے امانت سپرد کرتے ہیں، منظور ہے یا نہیں۔ سانپ نے جواب دیا مجھے بسر و چشم منظور ہے۔ حکم ہوا منہ کھول دے۔ اس نے منہ کھولا۔ فرشتوں کو حکم ہوا کہ دوزخ لاؤ اور اس سانپ کے منہ میں رکھ دو۔ فرشتوں نے دوزخ لا کر اسکے منہ میں رکھ دی اور منہ باندھ دیا۔ اب دوزخ اس سانپ کے منہ میں ہے ساتویں زمین کے نیچے۔ اگر دوزخ سانپ کے منہ میں زیر زمین نہ ہوتی تو تمام عالم جل جاتا۔"

ایک مجلس میں الحمد شریف کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ

"میں اور خواجہ عثمان ہارونیؒ سفر میں تھے۔ دجلہ کے کنارے پہنچے، دریا طغیانی پر تھا۔ میں فکر میں ہوا کہ کس طرح پار اتریں، اور جلد عبور کرنے کی ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ آنکھیں بند کرو۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ تھوڑی دیر میں کھولیں۔ خود اور حضرت خواجہ کو دجلہ کے پار پایا۔ میں نے دریافت کیا کہ کس طرح عبور فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ الحمد شریف کو پانچ مرتبہ پڑھ کر پانی پہ قدم رکھا اور پار اتر گئے۔"

ایک دفعہ فرمایا۔ کہ

"جب حضرت آدم سے لغزش ہوئی تو تمام چیزیں حضرت کو دیکھ کر رونے لگیں لیکن چاندی اور سونا نے آنسو نہ نکالے اور خدا سے عرض کی کہ ہم ان کے حال پہ نہ روئیں گے جو تیرا گناہ کرے۔ اللہ تعالےٰ نے یہ عرض سنکر قسم کھائی اور کہا کہ میں تمہاری قیمت مقرر کر دوں گا اور بنی آدم کو تمہارا خادم بنا دوں گا۔"

اس کے بعد فرمایا کہ جنگل میں ایک درویش رحلت کردہ کی لاش کو دیکھا کہ ہنس رہی تھی۔ پوچھا تم تو مر چکے ہو اب کیونکر ہنستے ہو۔ جواب دیا کہ محبت حق تعالیٰ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

فوائد السالکین

اب آپ فوائد السالکین کو دیکھئے جو خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکیؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ اور جنہیں اُن کے خلیفہ خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ خواجہ صاحب قصبہ اوش کے رہنے والے تھے جو ماوراالنہر کا ایک قصبہ ہے۔ آپ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ کی والدہ پندرہ پارہ کی حافظ تھیں اور ایام حمل میں قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف رہتی تھیں۔ اس لئے آپ پیدائش ہی سے پندرہ پارہ کے حافظ تھے۔

آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ۔

"بدخشاں میں ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے حاکم وقت کو حکم دیا کہ ایک خانقاہ تیار کرد۔ اس نے خانقاہ تیار کرائی تو آپ نے حکم دیا کہ ہر روز بازار سے ایک کتا خرید کر لائیں۔ حسب الحکم روز کتے خرید کر لاتے۔ آپ اُنکا ہاتھ پکڑ کر سجادہ پر بٹھلاتے اور فرماتے۔ خدا کے سپرد کیا۔ آخر الامر وہ کتے ایسے ہو گئے کہ ہر ایک ان میں کا پانی پر چلتا تھا اور جس کسی کو وہ نقش دے دیتا، اچھا ہو جاتا۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"میں اور قاضی حمیدالدین ایک سفر میں تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا بچھو ہے۔ جو دریا کی جانب روانہ ہو رہا ہے۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو لئے۔ دریا پر پہنچے تو دریا زور شور سے رواں تھا، اور کوئی کشتی وغیرہ موجود نہ تھی۔ ہم نے اللہ سے دعا کی کہ اگر ہم نے اپنا کام کمال کو پہنچا لیا ہو تو دریا ہمیں راہ دے دے۔ ناگاہ دریا شق ہو گیا اور درمیان دریا راہ ہویدا ہوئی۔ ہم اس راہ میں رواں ہو کر پار اُتر گئے۔ وہ بچھو ہمارے آگے آگے تھا۔ بچھو ایک درخت کے نیچے پہنچا جس کے سائے میں ایک مرد سو رہا تھا، اور ایک اژدہا اس کو کاٹنے کے لئے آ رہا تھا۔ بچھو نے سانپ کے ڈنگ مارا اور سانپ مر گیا۔ تو بچھو غائب ہو گیا۔ وزن اس سانپ کا ہزار من کا ہوگا۔ ہم اس شخص کے قریب گئے تو معلوم ہوا کہ وہ شرابی ہے۔ شراب پی کر قے کی ہے اور بدمست پڑا ہے۔ ہم متعجب ہوئے کہ ایسے نافرمان شخص پر اللہ نے ایسی نوازش فرمائی ہے۔ جونہی یہ اندیشہ ہمارے دل میں گزرا۔ ہاتف غیبی نے آواز دی کہ اگر ہم پارساؤں پر ہی اپنی توجہ مبذول رکھیں تو غریبوں کا حامی کون ہوگا؟"

ایک مجلس میں فرمایا کہ خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ایک مرید نے آپ سے کہا کہ میرے ہمسایہ نے میرے مکان سے متصل ایک چوبارہ بنوایا ہے جس سے میرا مکان بے پردہ ہو گیا ہے۔ آپ نے دریافت کیا کہ وہ شخص یہ جانتا ہے یا نہیں کہ تم میرے مرید ہو۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے واقف ہے۔

آپ نے یکایک زبان مبارک سے فرمایا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ کوٹھے پر سے گر نہیں پڑتا اور اس کا مہرہ گردن ٹوٹ نہیں جاتا۔ اس اثناء میں وہ مرید اپنے گھر کو گیا۔ راستے میں سنا کہ وہ شخص کوٹھے سے گر پڑا ہے اور اس کی گردن کا مہرہ ٹوٹ گیا ہے۔

پھر فرمایا کہ بغداد شریف میں ایک شخص کو جرم قتل کی سزا میں قتل کرنے لگے اور قاعدے کے موافق اس کا منہ قبلہ رُخ کرنے لگے تو اس نے اپنا منہ قبلہ سے پھیر کر اپنے پیر کے مزار کی طرف کر لیا۔ جلاد نے کہا کہ مرتے وقت اپنا رُخ قبلہ کی طرف کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ تو اپنا کام کر۔ میں نے اپنا منہ اپنے قبلہ کیطرف کر لیا ہے۔ وہ دونوں اسی حیص بیص میں تھے کہ خلیفہ کا قاصد آیا اور اس نے کہا کہ اس شخص کا جرم خلیفہ نے معاف کر دیا ہے۔ اس پہ خواجہ قطب عالمؒ نے فرمایا کہ دیکھو۔ اس شخص کی خوش عقیدگی نے اسے قتل سے صاف بچا لیا۔"

ایک مرتبہ فرمایا کہ۔

" حضرت خواجہ مودود چشتیؒ کو جب اشتیاق خانہ کعبہ کا غالب آتا تو اُسے فرشتے سرزمین چشت میں لے آتے کہ خواجہ صاحب زیارت سے مشرف ہوں "

راحتُ القلوبْ

اب اس مجموعہ کی طرف آیئے جو ان سب میں بڑا ہے۔ یعنی " راحتُ القلوب "۔ اس میں خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے وہ ملفوظات ہیں جنہیں خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ خواجہ گنج شکرؒ اجودھن کے رہنے والے تھے۔ محرم ۶۶۸ ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار پاکپتن (ضلع منٹگمری) میں ہے آپ کے لقب (گنج شکرؒ) کی وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک بنجارہ گزرا جس کے بوروں میں شکر لدی ہوئی تھی۔ آپ نے پوچھا کہ بوروں میں کیا ہے؟ اس نے ازراہِ ظرافت کہا کہ نمک ہے۔ گھر جا کر بورے کھولے تو ان سب میں نمک ہی نمک تھا۔ وہ روتا ہوا حاضر خدمت ہوا تو آپ نے فرمایا کہ بہت اچھا، وہ شکر تھی تو شکر ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ شکر بن گئی۔

ایک مجلس میں گفتگو دربارۂ خرقہ درویشی ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ کہ

"جب رسول اللہ معراج سے واپس آئے تو آپ نے صحابہ رض سے فرمایا۔ کہ مجھے فرمانِ الٰہی ہوا ہے۔ کہ خرقۂ درویشی اس شخص کو دوں جو میرے سوال کا جواب شافی دے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رض، حضرت عمر فاروق رض، اور حضرت عثمان غنی رض سے یہ سوال کیا کہ اگر یہ خرقہ تمہیں دے دیا جائے تو تم کیا کرو گے؟

حضرت صدیق رض نے کہا کہ میں سب کچھ خدا کی راہ میں نثار کر دوں گا۔ حضرت عمر رض نے کہا کہ میں عدل و انصاف کروں گا۔ مظلوموں کی داد کو پہنچوں گا۔ حضرت عثمان رض نے کہا کہ میں حیا اور سخاوت اختیار کروں گا۔ لیکن ان میں سے کسی کا جواب اطمینان بخش نہ تھا۔ اس کے بعد آپ نے حضرت علی رض سے سوال کیا۔ کہ اگر یہ خرقہ تمہیں دے دیا جائے تو تم کیا کرو گے۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر مجھے خرقہ عطا کر دیا جائے تو میں بندگانِ خدا کی پردہ پوشی کروں گا۔ چنانچہ آپ نے وہ خرقہ حضرت علی رض کو دے دیا۔"

ایک دفعہ فرمایا۔ کہ

"خواجہ ابوسعید ابوالخیر ایک دفعہ ذکرِ خدا میں مشغول تھے کہ بال کی جڑ سے خون روانہ ہونے لگا۔ اہل خانہ نے ایک کاسہ چوبیں نشست کے نیچے رکھ دیا۔ کہ جو خون بہے وہ کاسہ میں جمع ہو جائے۔ آپ کے جسم مبارک سے اس قدر خون رواں تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ کاسہ بھر گیا۔ اور اہل خانہ نے وہ خون پی لیا۔"

ایک مجلس میں فرمایا۔ کہ

"نواح غزنی میں میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ نہایت ضعیف اور لاغر تھے۔ ان کی عادت تھی۔ کہ ہر شب ایک سو بیس رکعات نماز نفل ادا فرماتے تھے۔ لیکن عارضہ شکم کی وجہ سے ہر دو رکعت کے بعد انہیں قضائے حاجت کی ضرورت ہوتی تھی۔ آپ قضائے حاجت کے واسطے تشریف لے جاتے۔ واپس آکر غسل فرماتے اور دوگانہ ادا کرتے۔ پھر قضائے حاجت ہوتی اور غسل کرتے اور دوگانہ ادا کرتے۔ مختصراً یہ کہ اس شب وہ ساٹھ مرتبہ نہاتے اور اپنا وظیفہ ادا کیا۔ آخر بار جب نہانے تشریف لے گئے تو میاں آپ انتقال فرمایا۔ سبحان اللہ! کیسے مضبوط اور راسخ العقیدہ تھے۔"

ایک دفعہ فرمایا کہ

"جب مغلوں نے یمن کا محاصرہ کیا تو والیٔ یمن حضرت خواجہ ابواللیث کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ آپ نے وہ خلیفہ کو عطا فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ غروبِ آفتاب کے وقت مغلوں پر شبخون مارنا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور جونہی وہ لکڑی لشکرِ مغل پر پھینکی انہیں ہزیمت واقع

ہوئی اور وہ لڑتے لڑتے بھاگ گئے۔"

اسی طرح ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ ایک سیّاح نے مجھ سے یہ حکایت بیان کی تھی کہ میں نے شہر دمشق کو اجاڑ پایا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کے بعض باشندوں نے وظیفہ ترک کر دیا تھا۔ ناگاہ مغلوں کا لشکر ان کے شہر میں آیا اور شہر کو ویران کر دیا۔"

چونکہ یہ ایک تاریخی بات ہے جو درمیان میں آگئی ہے، اس لئے آپ کی اطلاع کیلئے ہم اتنا بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یمن پر مغلوں کا حملہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔ باقی رہا مغلوں کا دمشق پر حملہ سو دمشق پر پہلی بار تیمور کے زمانے میں مغلوں نے حملہ کیا تھا جو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے قریب سو سال بعد کا واقعہ ہے۔

ایک مجلس میں فرمایا۔ کہ

"ایک نوجوان واصلانِ حق میں سے تھا۔ جب عمر اس کی تمام ہوئی ملک الموت نے اسے شرق سے غرب تک ڈھونڈا لیکن نہیں پتہ پایا۔ مجبور اپنے مقام پر آکر سجدہ میں سر رکھا، اور خدا سے درخواست کی کہ وہ اس نوجوان کا پتہ بتا دیں۔ حکم خدا ہوا کہ اس نوجوان کو فلاں خرابہ میں تلاش کرو۔ لیکن ملک الموت کو اس کا وہاں بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے کہا۔ اے ملک الموت! تم ہمارے دوستوں کی روح قبض نہیں کر سکتے اور نہ ان کو دیکھ سکتے ہو۔ وہ لوگ میرے پاس ہیں۔

ایک مرتبہ فرمایا۔ کہ

"شیخ جلال الدین رومی کبھی روم میں نماز نہ پڑھتے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا آپ غائب ہو جاتے آخر معلوم ہوا کہ آپ شرعاً و تعظیماً خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔"

ایک جگہ لکھا ہے کہ۔

"ایک جوگی حضرت (بابا فرید) کی خدمت میں آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ کوئی کرامت دکھاؤ۔ یہ سنکر وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ آپ نے اپنی جوتیاں ہوا میں چھوڑ دیں۔ وہ اس جوگی کے سر سے اونچی چلی گئیں۔ چنانچہ جوگی معترف ہوا کہ جس شخص کی جوتیوں کا یہ مرتبہ ہے وہ خود کس مرتبے کا ہوگا۔"

ایک مرتبہ آپ نے اپنی ریاضت کے متعلق فرمایا۔ کہ

"میں بیس سال عالم تفکر میں کھڑا رہا۔ بالکل نہیں بیٹھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس بیس سال میں میں نے کچھ کھایا ہو۔"

اس مجلس میں حضرت عمرؓ کے مناقب بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک دہی بیچنے والا راستے میں کھڑا رو رہا ہے۔ اس نے کہا کہ میرا دہی زمین پر گر گیا تھا۔ زمین اسے

پی گئی ہے۔ کیا آپ روا رکھ سکتے ہیں۔ یہ سنکر آپ نے درّہ اٹھا کر نعرہ مارا کہ اے زمین! تو دہی واپس دیتی ہے یا نہیں؟ یہ سنتے ہی زمین پھٹ گئی اور دہی اوپر نکل آیا۔ اس دہی والے نے اپنا سبوچہ دہی سے بھر لیا اور چل دیا۔"

اسی طرح فرمایا کہ "ایک دفعہ حضرت عمرؓ اپنا خرقہ سی رہے تھے اور پشت آپ کی جانب آفتاب تھی۔ پشت آپ کی تمازتِ آفتاب سے گرم ہو گئی تو آپ نے نگاہِ غضب سے آفتاب کی طرف دیکھا۔ معًا فرشتوں کو حکم ہوا کہ نورِ آفتاب کا محو کریں کہ حضرت عمرؓ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا ہے۔ فرشتوں نے فی الفور تعمیل کی اور نور آفتاب سے لے لیا۔ جملہ جہاں تاریک ہو گیا۔ رسول اللہؐ اس زمانہ میں حیات تھے۔ از حد غمناک ہوئے۔ فرمانے لگے کہ شاید قیامت قائم ہو گئی جو نور آفتاب سے لے لیا گیا۔ یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت جبریلؑ نازل ہوئے اور بیان کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت قائم نہیں ہوئی بلکہ آفتاب کا نور حضرت عمرؓ کی گستاخی کی وجہ سے چھین لیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ نے حضرت عمرؓ کو طلب فرمایا اور شفاعت کی۔ حضرت عمرؓ نے سورج کو معاف کر دیا۔ فی الفور جہان روشن ہو گیا۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"عہدِ رسول اللہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص کے ہاں دو بچے توام پیدا ہوئے۔ یہ خبر آنحضرتؐ کو پہنچائی گئی اور عرض کیا گیا کہ ان کے جدا کرنے کی ترکیب فرمایئے۔ آپ متفکر تھے کہ حضرت جبریلؑ تشریف لائے اور کہا کہ یا رسول اللہ! ان کے سروں میں ایک ہی کنگھا کرنا چاہیئے، علیحدہ ہو جائیں گے۔ ایسا ہی کیا گیا، اور وہ الگ الگ ہو گئے۔"

ایک مرتبہ فرمایا کہ سورۂ ملک کا نام توریت میں ماثورہ ہے اور ماثورہ کا ترجمہ (فارسی میں) عذابِ گور سے باز رکھنے والا ہے۔

اس مجلس میں فرمایا کہ

"جب خواجہ عبداللہ سہیل تستری کا انتقال ہوا ہے تو شہر میں یہودیوں کی ایک جماعت سخت منکر تھی۔ ان میں سے ایک یہودی نے جنازہ کے قریب آکر کہا کہ اگر آپ مجھے اس وقت تلقین کریں تو میں مسلمان ہوتا ہوں اور میرے ساتھ ہزار آدمی اور مسلمان ہونگے۔ وہ یہ بات پوری نہ کر چکا تھا کہ آپ نے کفن سے ہاتھ باہر نکالا اور دونوں آنکھیں کھول کر کہا ـــ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ـــ چنانچہ اس پر وہ سب مسلمان ہو گئے۔"

اسی طرح جب خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ کا انتقال ہوا ہے اور لوگوں نے چاہا کہ جنازہ اٹھائیں

تو جنازہ خود بخود ہوا میں معلق ہو کر چلنے لگا۔ دفن کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ جنازہ کو فرشتے اٹھائے تھے۔ یہ بیان کر کے آپ نعرہ مار کر بیہوش ہو گئے اور دیر تک بے ہوش پڑے رہے۔"

ایک مجلس میں فرمایا۔ کہ

"ایک روز حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مع اصحاب ایک جا متمکن تھے۔ معاویہؓ، یزید کو اپنے کندھے پر سوار کئے ہوئے گذرے۔ رسولؐ اللہ نے تبسم کیا کہ سبحان اللہ! دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوار ہے۔ یہ ارشاد والا حضرت علیؓ نے سنا۔ دریافت کیا: یا رسولؐ اللہ! فرمائیے کہ پسر معاویہ کیونکر دوزخی ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ اے علیؓ! یزید بدبخت وہ ہے جو میرے حسنؓ و حسینؓ اور ان کی تمام اولاد کو شہید کرا دے گا۔ امیر المومنین حضرت علیؓ اٹھے، اور تلوار میان سے نکالی اور چاہا کہ یزید پلید کو مار ڈالیں۔ آنحضرتؐ مانع ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ حکم باریتعالیٰ کا ایسا ہی ہے۔ مخالفت تقدیر کی نہ کرنی چاہیئے۔"

آپ کی اطلاع کے لئے اتنا بتانا بھی ضروری ہے کہ یزید کی پیدائش ۲۶ھ میں ہوئی تھی۔ یعنے رسولؐ اللہ کی وفات کے بھی سولہ برس بعد۔

رَاحَتُ الْمُحِبِّیْن۔

اب چند ایک مثالیں "راحت المحبین" سے بھی ملاحظہ فرما لیجئے یہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات ہیں جنہیں امیر خسروؒ نے مرتب کیا تھا۔ خواجہ صاحب بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ۷۲۵ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ وہیں آپ کا مزار ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ۔

"آدم علیہ السلام بہشت سے کوہ سراندیپ میں (جواب لنکا یا جزیرہ سیلون کے نام سے مشہور ہے۔) اترے۔ تین (سو) برس تک اپنی لغزش کی بنا پر روتے رہے۔ چنانچہ گوشت پوست ان کے رخساروں کا بہہ گیا تھا اور چڑیوں نے ان کے رخساروں پر گھونسلے بنا لئے تھے اور ان کو اس کی خبر تک نہ تھی۔ آپ کے آنسوؤں سے زمین اس قدر تر ہو گئی کہ اس پر گھاس اگ آئی اور اتنی بلند ہو گئی کہ آپ کا وجود مبارک اس میں پوشیدہ ہو گیا۔

"ایک دفعہ فرمایا۔ کہ جس روز حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا ہے اور ایک بھیڑیئے کو پکڑ کر حضرت یعقوبؑ کی خدمت میں لے گئے کہ اس نے یوسفؑ کو ہلاک کیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اس بھیڑیئے سے پوچھا کہ تو نے یوسفؑ کو ہلاک کیا ہے؟ اس نے کہا کہ خیر (یعنے نہیں) آپؑ نے دوبارہ اس سے

دریافت کیا کہ تو جانتا ہے کہ یوسفؑ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا۔ حضرت مجھے معلوم نہیں۔ اگرچہ میں بانور ہوں۔ لیکن عیب جوئی اور عیب گوئی نہیں کرتا۔"

پھر فرمایا۔ کہ "حضرت ایوبؑ نے خدا سے دعا کی کہ مجھے بارہ ہزار زبانیں دے۔ تاکہ ہر زبان سے تیرا ذکر کروں۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں کیڑوں میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ ان کے جسم میں بارہ ہزار کیڑے تھے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا کہ وہ ہر رات میں ایک ہزار رکعت نماز نفل ادا کیا کرتے تھے اور قریب صبح سر سجدہ میں رکھ کر عاجزی کیا کرتے تھے۔ اس وقت آپ کے ہر بن مو سے خون جاری ہو جاتا، اور ہر قطرہ سے جو زمین پر گرتا نقش تسبیح پیدا ہو جاتا۔ آپ کی کشتی کے متعلق فرمایا کہ اس کے لئے جبریلؑ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار تختے مہیا کئے اور اسی طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار کیلیں آسمان سے نازل کیں۔ ہر تختے پر ایک نبی کا نام لکھا تھا۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے نام کے بعد چار تختے خالی رہ گئے۔ آپ نے کہا کہ اب ان پر کس کا نام لکھا جائے گا۔ وحی ہوئی کہ رسولؐ اللہ کے چار یار ہوں گے۔ ان کے اسماء کے بغیر کشتی تیار نہیں ہو سکے گی۔ پھر فرمایا کہ آپ نے حضرت آدم کی نعش (جو صفا اور مروہ کے درمیان تھی) نکال کر اس کشتی میں رکھی۔ آپ کی کشتی میں ابلیس بھی سوار ہو گیا۔ آپ نے اسے نکالنا چاہا تو ارشاد خداوندی ہوا کہ اسے نہ نکالو ہم نے اسے انقراض عالم تک مہلت دے رکھی ہے۔"

ایک مرتبہ فرمایا۔ کہ "حضرت عیسےٰؑ آخری زمانہ میں دنیا میں اتریں گے اور اپنے معجزہ سے ایک مردہ زندہ کریں گے۔ وہ ابو طالب ہونگے۔" (ابوطالب حضرت علیؓ کے والد تھے)

ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ جب آدمی نماز میں مصروف ہوتا ہے، اسے اگلی پچھلی بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ فرمایا کہ میں نے حدیث شریف کی کتب میں دیکھا ہے کہ اَلصَّلٰوۃُ نُوْرٌ۔ یعنے نماز روشنائی ہے۔ وقت نماز کوئی شے پنہاں نہیں رہ سکتی۔ پس آدمی جب نماز پڑھنے لگتا ہے تو اسے سب بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں۔"

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا کہ "آپ کے والد نے نمرود کے ڈر سے انہیں ایک غار میں پھینک دیا تھا۔ چنانچہ آپ اس غار میں چودہ برس تک رہے جس آگ میں آپ کو ڈالا گیا تھا اسکے متعلق فرمایا کہ اس کی تپش ساٹھ کوس تک جاتی تھی۔ نمرود کے متعلق فرمایا کہ میں مچھر نے اسے ہلاک کیا تھا وہ لنگڑا تھا۔"

حضرت یوسفؑ کے متعلق فرمایا۔" ایک مرتبہ انہوں نے حضرت یعقوبؑ کو دیکھ کر تعظیم کے لئے گھوڑے سے اترنا چاہا لیکن اس میں ذرا دیر لگ گئی۔ اس پر جبریلؑ تشریف لائے اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ تم نے گھوڑے سے اترنے میں دیر لگا دی ہے اسلئے تمہاری اولاد میں کوئی پیغمبر نہیں ہوگا۔"

حضرت سلیمانؑ کے متعلق فرمایا کہ" ان کے باورچی خانہ میں ستر ہزار اونٹ روزانہ نمک لاتے تھے اور وہ روزانہ خرچ ہو جاتا تھا۔" حضرت موسیٰؑ کے متعلق فرمایا کہ" جب وہ پیدا ہوئے تو فرعون نے ایک تنور گرم کر کے انہیں اس تنور میں ڈلوا دیا۔"

ایک مرتبہ مجلس میں درود شریف کی فضیلت کا ذکر آگیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک روز حضرت عثمانؓ بازار سے مچھلی لائے اور اُسے بریاں کرنا چاہا مگر وہ بریاں نہ ہوتی تھی جس قدر لکڑیاں انبار خانے میں جمع تھیں سب جل گئیں لیکن وہ مچھلی اپنی اصلی حالت پر ہی رہی۔ وہ مچھلی رسول اللہ کے سامنے پیش کی گئی تو آپ کے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے دریا میں ایک طائفہ دیکھا تھا جو آپ پر درود بھیجتا تھا۔ میں نے بھی ان کی موافقت میں ایک مرتبہ آپ پر درود بھیجا تھا۔ اللہ نے اس کی برکت سے مجھ پر آگ حرام کر دی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ مہتر جبریلؑ نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ حضور میں آپ کی اور آپ کی اولاد کی خدمت کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ فردائے قیامت میں میرے حق میں سفارش فرمائیں گے اور اس روز مجھے فراموش نہ کریں گے۔

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ" ایک چیونٹی ان کے پاؤں تلے آکر مر گئی اور اس نے شدتِ درد سے سخت آہ کھینچی۔ آپ نے چیونٹی کو اٹھا کر خدا سے دعا کی کہ اگر تیری بارگاہ میں میری کچھ بھی عزت ہے تو اس چیونٹی کو زندہ کر دے۔ چنانچہ وہ چیونٹی اسی وقت زندہ ہو گئی۔"

اسی طرح ایک مرتبہ آپ کنگھی کر رہے تھے کہ آپ کی ڈاڑھی میں سے ایک بال ٹوٹا جسے ہوا اڑا کر یہودیوں کے قبرستان میں لے گئی۔ اس کی برکت سے تین دن تک عذاب ان کافروں پر نہ ہوا۔"

ایک مرتبہ فرمایا کہ" ایک بڑھیا روتی ہوئی حضرت مودود چشتی کے پاس آئی اور عرض کیا کہ حضور میرے اکلوتے بیٹے کو بادشاہ نے ناحق مروا دیا ہے۔ آپ یہ سنکر سر دار تشریف لے گئے اور اس لڑکے کی لاش سے کہا کہ اگر تو ناحق مارا گیا ہے تو اٹھ کھڑا ہو۔ لڑکا اسی وقت زندہ ہو گیا۔"

یہ نمونہ ہے حضرات اولیاء کرام کے ایک خانوادہ کے چند ایک ملفوظات کا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ دیگر اولیائے عظام کے ارشاداتِ گرامی کس قسم کے ہوں گے، اور ان کی اشاعت سے محکمہ اوقاف اسلام کی کتنی عظیم خدمت سرانجام دے گا؟ چونکہ ان شائع ہونے والی کتابوں میں، ان اولیائے کرام

ط یہ تمام اقتباسات پروفیسر صاحب کی کتاب" سلیم کے نام خطوط" جلد سوم سے لئے گئے ہیں۔

کے سوانح حیات بھی درج ہوں گے، اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کا ایک آدھ نمونہ بھی قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جاتے۔ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے عرس کی تقریب پر، نوائے وقت دکی اشاعت بابت ۱۵ (؟) میں، خواجہ صاحب کے کوائف حیات کے متعلق ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں مقالہ نگار نے، خواجہ صاحبؒ کی ابتدائی زندگی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا تھا۔

وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں ریاضت کر رہا تھا۔ نفس کی لذات سے محروم رہ کر حقیقت حق کی تلاش میں بے شمار صعوبتیں برداشت کر رہا تھا۔ ایک روز اسے پیاس لگی تو وہ چل کر کنوئیں تک آیا۔ وہاں نہ ڈول تھا نہ ڈوری۔ پانی تہ میں تارہ بنا تھا۔ مایوس ہوا واپس جا رہا تھا کہ دو ہرن آتے نظر پڑے۔ ہرن کنوئیں کے کنارے پر پہنچے تو پانی اُچھل کر کناروں تک پہنچ گیا۔ وہ شخص دیکھتا رہا۔ ہرنوں نے پانی پیا اور چل دیئے۔ وہ شخص بھی پیاس بجھانے کے لئے بڑھا، مگر پانی پھر نیچے اتر گیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا۔

"الٰہی! تو نے ہرنوں کو تو پانی پلا دیا مگر اپنے بندے کو کیوں محروم کر دیا؟"

آواز آئی۔ "تو نے ڈول اور ڈوری پر توکل کیا، جانوروں نے مجھ پر — وہ سیراب ہوتے اور تو محروم!"

اور یہ سنتے ہی وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں چلا گیا۔ چالیس دن عبادت میں گزارے۔ پانی کا ایک قطرہ بھی حلق میں نہ ڈالا۔ اور چالیس دن بعد اس نے ایک مٹھی خاک منہ میں ڈالی۔ خاک فوراً شکر ہو گئی اور آواز آئی۔

"فریدا! تو برگزیدہ بندوں میں سے ہوا کہ تیری عبادت قبول ہوئی اب تو گنج شکر ہے۔"

اور یہ گنج شکر شیخ فریدالدین وہی تھے، جنکا مزار مقدس پاک پٹن میں ہے اور جو برصغیر کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے لئے منبع فیض بنا ہوا ہے۔

...... آپ کے گنج شکر ہونے کی وجہ تسمیہ مختلف بیان کی جاتی ہیں۔ سیر العارفین میں لکھا ہے۔

"جس زمانے میں حضرت فریدالدینؒ اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کی خدمت میں تربیت پا رہے تھے تو ایک بار انہوں نے سات دن تک متواتر روزہ رکھا۔ افطار کے وقت اپنے حجرے سے خواجہ صاحب کے پاس جا رہے تھے کہ ایک جگہ کیچڑ میں پاؤں پھسل گیا، زمین پر گر پڑے، کیچڑ منہ میں چلی گئی۔ مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت سے وہ شکر بن گئی جب

مرشد کی خدمت میں پہنچکر یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اگر مٹی تمہارے منہ میں جاکر شکر بن گئی تو خداوند تعالیٰ تمہارے سارے وجود کو شکر بنادے گا۔ اور تم ہمیشہ شیریں رہوگے۔ اسکے بعد گنج شکر مشہور ہوگئے۔

خزینۃ الاصفیا کے مولف نے　　ایک حوالہ سے لکھا ہے۔ ایک سوداگر اونٹوں پر شکر لادکر ملتان سے دہلی کی طرف جارہا تھا۔ جب وہ اجودھن پہنچا تو شیخ فریدالدینؒ نے اس سے پوچھا کہ اونٹوں پر کیا ہے؟ سوداگر نے تمسخر سے جواب دیا کہ نمک ہے۔ شیخ فریدالدینؒ نے سن کر کہا بہتر ہے۔ نمک ہی ہوگا۔ سوداگر جب منزلِ مقصود پر پہنچا تو اونٹوں پر شکر کی بجائے نمک پاکر سخت گھبرایا۔ اسی وقت واپس ہوا اور شیخ فریدؒ کی خدمت میں پہنچکر اپنی تقصیر کی معافی چاہی۔ شیخ نے فرمایا۔ اگر شکر تھی تو شکر ہوجائے گی۔ چنانچہ نمک شکر میں تبدیل ہوگیا۔ بیرم خاں، خانِ خاناں نے اس واقعہ کو منظوم کیا۔ ایک شعر ہے ۔

کانِ نمک، جہانِ شکر، شیخ بحر و بر
آں کز شکر نمک کند و از نمک شکر!

۔۔۔۔۔ حضرت گنج شکرؒ نے راہِ سلوک کے طے کرنے میں بڑی محنتِ شاقہ کی۔ خود فرماتے ہیں کہ آپ بیس سال تک عالمِ تفکر میں کھڑے رہے۔ آپ کے پاؤں سوج گئے تھے اور ان سے خون بہتا تھا۔ اس درمیان میں آپ کو یاد نہیں کہ آپ نے کچھ کھایا ہو۔

کہا یہ جاتا ہے کہ ان حضرات نے اسلام کو پھیلایا۔ اس لئے ان کی تعلیم کی عام اشاعت، اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے۔ بات بظاہر بڑی جی لگتی ہوتی ہے۔ لیکن ذرا دیکھئے کہ وہ تعلیم کیا تھی جسے ان حضرات نے پھیلایا۔ شیخ محی الدین ابن عربی، صوفیائے کرام کے سرخیل شمار کئے جاتے ہیں۔ (انہیں اسی جہت سے "شیخِ اکبر" کہا جاتا ہے) "فتوحاتِ مکیہ" اور "فصوص الحکم" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ وہ، فصوص الحکم میں، اپنے پیش کردہ فلسفہ وحدتِ وجود کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ وہ کہے ـــــ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی۔ کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔

"عشق" اور "معرفتِ خداوندی" ان حضرات کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ "عشق" کے متعلق خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ "سیر الاولیا۔ مرتبہ خواجہ بدر اسحٰق (خلیفہ بابا فریدؒ) میں فرماتے ہیں:۔

فقراء کا عشق علماء اور اصحابِ عقل کے عشق سے بالکل جدا ہے۔ اِس عشق کی راہ میں محبت کے سات سو مقامات ہیں۔ اس عشق کا عنصر صرف آگ ہوتی ہے جس کے شعلے سے تمام عالم جل کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس عشق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ عشق اپنی دوئی کھو کر اپنے آپ سے بالکل ایک ہو جاتا ہے عشق میں عاشق اپنے معشوق کی طلب میں مجاہدہ کرتا ہے جس سے اس کو مکاشفہ ہوتا ہے۔ مکاشفہ کے بعد مشاہدہ یعنے دیدار۔ اس مشاہدہ سے اس کا عشق اور بھی تیز ہو جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ حجابات اٹھتے جاتے ہیں۔ اور عاشق ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ صرف عالمِ تحیّر میں رہتا ہے۔"

حضرت داتا گنج بخشؒ (ابوالحسن علی ہجویری) کا نام کس نے نہیں سنا۔ وہ عورت کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں :-

بہشت میں سب سے پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا اس کی اصل عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا — یعنے ہابیل و قابیل کی لڑائی — اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت ہی قرار دیا۔ اور آج دینی اور دنیاوی فتنوں کے تمام سباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہی ہیں۔ (ہفتہ وار منہاج۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۵۵ء)

یہ ہے نمونہ ان کتابوں کے مندرجات کا جنہیں اب محکمۂ اوقاف کی طرف سے نہایت سعی و کاوش کے بعد شائع کیا جائے گا۔ کتنی جلیل القدر ہے اسلام کی یہ خدمت جو اس محکمہ کے حسنِ انتظام کی بدولت سرانجام پا رہی ہے۔ اور کس قدر صحیح مصرف ہے اس بے شمار دولت کا جسے اس سے پہلے ان خانقاہوں کے مجاور ضائع کر دیا کرتے تھے۔ کیسا صحیح مشورہ دیا تھا ابلیس نے اپنے مشیروں کو مسلمان کے متعلق کہ ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے!
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے

(ارمغانِ حجاز۔ اقبال)

بابُ المراسلات

۱۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

فکرِ طلوعِ اسلام سے متعلق ایک صاحب لکھتے ہیں کہ جب ہم قرآنِ مجید کے نظامِ ربوبیت کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شخص اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہے گا، کیونکہ اس وقت دولت کی تقسیم ناہموار نہیں ہوگی، تو اس کے خلاف اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ پہلے تم لوگ اپنے مکانات، کاروبار، روپیہ پیسہ دوسروں کو دے دو پھر اس قسم کی باتیں کرو اور اس کے لئے قرآن شریف کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں کہ ـــــ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ـــــ تم جو کچھ خود نہیں کرتے اسے دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔ اس کے متعلق طلوعِ اسلام میں لکھنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہ اعتراض عام طور پر کیا جاتا ہے۔

طلوعِ اسلام

یہ اعتراض اگر نیک نیتی سے کیا جاتا ہے تو معترض کی کم فہمی کی دلیل ہے، اور اگر بدنیتی سے کیا جاتا ہے تو منافقت کی نشانی اور یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (خدا کی راہ سے روکنے) کی سعی مذموم۔

ہم کہتے یہ ہیں کہ جب ملک میں غلط معاشی نظام رائج ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت چند مراکز میں جمع ہونی شروع ہو جاتی ہے اور عام آبادی اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم ہو جاتی ہے اس تباہی سے بچنے کی صورت، ملک میں صحیح معاشی نظام کی ترویج ہے جسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہتے ہیں۔ اس نظام کی رُو سے، وسائل پیداوار، انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے، امت کی تحویل میں رہتے ہیں، تاکہ نظامِ مملکت اس پیداوار کی تقسیم ہر ایک کی ضروریات کے مطابق کرے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ

غلط نظام کی جگہ صحیح قرآنی نظام کا رائج کرنا، کسی ایک فرد کا کام نہیں۔ یہ تو مملکت کے کرنے کا کام ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ملک کے اربابِ دانش و بینش تک قرآن کا یہ پیغام پہنچاتے جائیں تاکہ آئینی طور پر اس نظام کے قائم ہونے کے لئے فضا سازگار ہو جائے۔ ایسا کہنے والے سے یہ کہنا کہ ۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۔ یا جہالت ہے یا شرارت۔ اِس آیت سے اگر یہی مفہوم لیا جائے جس کے لئے یہ حضرات اِسے پیش کر دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص کسی غلط نظام کو غلط کہے تو اُسے یہ کہہ کر چُپ کرا دیا جائے کہ میاں! پہلے خود صحیح نظام قائم کرو اس کے بعد اس نظام کو غلط کہو۔ جب تم صحیح نظام قائم نہیں کرتے تو موجودہ نظام کو غلط کیوں کہتے ہو۔ اس منطق کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے تدبر و فراست کی بنا پر کہے کہ مجھے خدشہ نظر آتا ہے کہ فلاں سمت سے دشمن ہمارے ملک پر حملہ کر دے گا اس لئے ہمیں چاہیئے کہ سرحد پر ایک لشکرِ جرار بھیج دیں۔ تو اس کے جواب میں اس سے کہا جائے کہ آپ پہلے خود رائفل لے کر اس سرحد پر جا کر کھڑے ہو جائیے اور پھر قوم سے کہیئے کہ وہاں فوج بھیج دے۔ تمہیں خدا کا یہ ارشاد یاد نہیں کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

غلط معاشی نظام میں، آپ حسبِ استطاعت کسی غریب کی کچھ مدد کر سکتے ہیں، لیکن یہ ملک کی کثیر آبادی کے افلاس اور محتاجی کا علاج نہیں۔ اول تو یہ دیکھئے کہ اس سے آپ کتنے لوگوں کی ضروریات پوری کر سکیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ اس سے ان کی کوئی ہنگامی ضرورت پوری ہو سکے گی، ان کی احتیاج کا مستقل علاج نہیں ہو سکے گا۔ غلط معاشی نظام کا علاج خیرات نہیں (خواہ اس کا نام زکوٰۃ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) اس کا علاج صحیح قرآنی نظام کا قیام ہے اگر غلط نظام میں آپ اپنا سب کچھ دوسروں کو دے دیں گے تو ملک کا افلاس تو دور نہیں ہو سکے گا البتہ اس سے محتاجوں کی صف میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا (یعنے آپ کا شمار بھی ملک کے محتاجوں میں ہو جائیگا)۔ قرآن کا یہ حکم کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں، ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب) صحیح معاشی نظام کا حکم ہے جس میں کسی کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ کل کو مجھ پر اگر کوئی مصیبت آ پڑی تو میرا کیا بنے گا؟ غلط معاشی نظام میں آپ اس حکم پر عمل کیجئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کل کو آپکو (خدانخواستہ) کوئی حادثہ پیش آجائے تو آپ بھیک مانگتے پھریں گے۔ غلط نظام میں قرآن کی ہدایت یہی ہے کہ تم نہ تو اس قدر بخل کرو کہ بالکل ہاتھ سکیڑ لو اور نہ ہی اس قدر ہاتھ کشادہ کر دو کہ کل کو تمہیں خود دوسروں کا دست نگر ہونا پڑے (۱۷ : ۲۹)۔ ہاں، اگر صحیح نظام قائم ہو رہا ہو تو پھر اس کے لئے جان اور مال دونوں پیش کر دینے چاہئیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس وقت ہم نہ تو ذی استطاعت

حضرات سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنا سب کچھ غریبوں کو دے دیں اور نہ ہی غریبوں اور محتاجوں سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اٹھ کر امیروں کا سب کچھ لوٹ لیں۔ یہ دونوں انداز غلط ہیں۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ آئینی طور پر صحیح قرآنی نظام کے قیام کے لئے ذہنی فضا کو سازگار بنانا چاہیئے اور اس دوران میں جس قدر کسی سے ہو سکے، غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنی چاہیئے تاکہ ان کی وقتی مشکلات کسی حد تک دور ہو جائیں۔

یاد رکھیئے! غلط کار اور غلط اندیش لوگ، جو خدا کی راہ میں روک بن کر کھڑے رہنا چاہتے ہیں، اس قسم کی آیات (مثل لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ) سے بڑا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس اپنی غلط روش کے جواز کے لئے کوئی دلیل اور سند نہیں ہوتی تو وہ ان حربوں پر اُتر آتے ہیں اور اس قسم کی باتوں سے لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک شخص جس بات کی دعوت دوسروں کو دیتا ہے، اس سلسلے میں جو کچھ اس کے اپنے اختیار اور استطاعت میں ہے، اگر وہ اس پر عمل نہیں کرتا، تو وہ اس حد تک واقعی موردِ الزام ہے۔ (مثلاً) اگر کسی ملک کا ذی اقتدار حاکم یہ کہتا ہے کہ ملک میں نظامِ عدل قائم کرنا چاہیئے اور وہ (یا وصفِ اختیار) ایسا نظام قائم نہیں کرتا تو اسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ لیکن اگر اس ملک کی رعایا کا کوئی مظلوم یہ کہتا ہے کہ یہاں نظامِ عدل قائم ہونا چاہیئے، تو اس سے یہ کہنا کہ "تم جو کچھ کہتے ہو، وہ کر کے کیوں نہیں دکھاتے" حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

اور پھر اسے بھی سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص اپنی استطاعت کے باوجود وہ کچھ نہیں کرتا جس کی تلقین وہ دوسروں کو کرتا ہے، تو اسے اس جرم کا خمیازہ خود بھگتنا پڑے گا۔ آپ اسے یہ کہہ کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے کہ "جب تم خود ایسا نہیں کرتے تو تمہیں مجھے تلقین کرنے کا کیا حق ہے" آپ یہ دیکھئے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر وہ صحیح ہے تو آپ اُسے اختیار کر لیجئے۔ اُس کا غلط عمل آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ اُس کے لئے خدا کا حکم ہے اور آپ کے لئے خدا کا ارشاد یہ ہے کہ۔

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۔ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵/۱۰۵)

تم یہ دیکھو کہ تمہاری ذات کی اصلاح کس طرح ہوتی ہے۔ اگر تم صحیح راستہ اختیار کر لوگے، تو کسی دوسرے کا غلط راستے پر چلنا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

اپنی اصلاح کرو اور دوسروں کو صحیح راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرو۔ لیکن اگر کوئی شخص تمہاری راہ نمائی صحیح راستے کی طرف کرتا ہے، لیکن خود غلط راستے پر چلتا ہے، تو تم یہ کہہ کر غلط راستے پر نہ

چلتے جاؤ کہ جب تم خود صحیح راستے پر نہیں چلتے تو تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ تم مجھ سے کہو کہ میرا راستہ غلط ہے اگر تم اس کے کہنے پر صحیح راستہ اختیار کر لوگے تو اس شخص کا غلط راستے پر چلنا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ تم صحیح منزل تک پہنچ جاؤ گے۔

یاد رکھیے! یہ انسانی نفس کی بڑی مکاری ہے کہ وہ غلط راستہ چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرنے والے کو یہ کہہ کر کہ جب تم خود اس پر عمل نہیں کرتے، تو مجھے غلط راستہ چھوڑنے کو کیوں کہتے ہو، اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے کہ میں نے بڑا تیر مارا ہے جو دوسرے کو لاجواب کر دیا ہے اسی طرح، وہ لوگ جو دوسروں کو صحیح راستے کی طرف آنے سے یہ کہہ کر روکتے ہیں کہ جو شخص صحیح راستے کی نشاندہی کر رہا ہے، اس کا اپنا عمل تو دیکھو، ان کا خبثِ باطن انہیں اس پر اکساتا ہے۔ نیک نیت لوگوں کا شیوہ یہی ہونا چاہیئے کہ وہ دوسروں سے کہیں کہ

عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۔ (۵/۱۰۵)

صحیح بات کی طرف دعوت دینے والا لیکن استطاعت کے باوجود اس پر عمل نہ کرنے والا، غلط عمل کا خمیازہ، خود بھگتے گا اور صحیح بات سنکر اس پر عمل نہ کرنے والا، اپنی غلط روش کا نقصان خود اٹھائیگا۔

لہٰذا اس سلسلہ میں صحیح روش یہ ہے کہ

۱۔ صحیح راستے کی طرف دعوت دینے والے کو چاہیئے کہ جس حد تک اس کے لئے ممکن ہو، اپنی دعوت پر خود بھی عمل کرے۔

۲۔ اگر وہ دعوت کسی ایسے پروگرام کی ہے جسے بروئے کار لانا اس کے بس کی بات نہیں، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اس کی طرف دعوت ہی نہ دے۔

۳۔ اگر اس کی دعوت صحیح ہے اور وہ خود اس پر عمل نہیں کرتا تو آپ یہ کہہ کر غلط راستے پر نہ چلتے جایئے کہ جب وہ اپنی دعوت پر خود عمل نہیں کرتا، تو اسے دوسروں کو ایسا کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔ نہ ہی کسی صحیح دعوت کی اس لئے مخالفت کیجئے کہ اس کا داعی اس پر خود عمل پیرا نہیں۔ بات کو پرکھو۔ کہنے والے کے عمل کو اپنے لئے دلیل مت بناؤ۔ صحیح بات، صحیح ہوتی ہے خواہ اس پر دنیا کا کوئی انسان بھی عمل نہ کر رہا ہو۔

۲۔ زنا کی سزا ــــ سنگساری

ایک صاحب گجرات سے لکھتے ہیں کہ اخبار مشرق (لاہور) میں حال ہی میں یہ خبر چھپی تھی کہ اسلامی

مشاورتی کونسل نے اسلامی قوانین کے نفاذ کی نسبت جو سفارشات حکومت کو بھیجی ہیں ان میں ایک سفارش یہ ہے کہ زنا کی سزا موت بذریعہ سنگساری یعنے رجم ہونی چاہیئے۔ میرا خیال تھا کہ اکتوبر کے طلوعِ اسلام میں اس سوال کو اٹھایا جائے گا کہ رجم کی سزا کا قرآن مجید میں مطلقاً ذکر نہیں ہے اور چونکہ مروجہ آئین کتاب وسنت کے مطابق احکام نافذ کرنے کا پابند ہے اس لئے یہ سفارش حکومت کو قابلِ قبول نہیں ہونی چاہیئے..... امید ہے کہ آئندہ ماہ کے پرچہ میں یہ سوال ضرور زیرِ بحث آئے گا۔"

طلوعِ اسلام

ہم نے اس سوال کو اس لئے نہیں اٹھایا تھا کہ (اول تو) ہم اس موضوع پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ اس لئے ہم نے اسے دہرانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اور دوسرے اس لئے کہ ملک میں قانون سازی کا کام جس انداز سے سرانجام پا رہا ہے وہ ہمارے نزدیک کسی سنجیدہ توجہ کا سزاوار ہی نہیں۔ قانون سازی کے سلسلہ میں، سب سے پہلا اور بنیادی کام یہ ہوتا ہے کہ ان اصولوں کو متعین کیا جائے جن کے مطابق قوانین مرتب کئے جائیں گے۔ اس کے لئے آئینِ پاکستان میں صرف اتنا مذکور ہے کہ ملک کے قوانین کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوں گے۔ کتاب (قرآن کریم) تو بہرحال ایک متعین کتاب ہے۔ اس لئے اس کا طے کرنا مشکل نہیں کہ کوئی قانون، قرآن کے خلاف ہے یا نہیں۔ لیکن "سنت" کی اصطلاح ایسی ہے جس کا آج تک کوئی متفق علیہ مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ اور نہ ہی یہ طے پا سکا ہے کہ متفق علیہ سنت، کس کتاب میں ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر فرقہ اپنے ہر عمل کو عین مطابق سنت قرار دیتا ہے اور دوسرا فرقہ اسی عمل کو خلافِ اسلام۔ جب تک بات فرقوں تک محدود تھی، اس کا نتیجہ باہمی بحث وجدل اور سر پھٹول تھا۔ لیکن جب یہ بات کسی مملکت کی قانون سازی تک پہنچ جائے تو اس وقت اس بنیادی معیار کو جس کے مطابق قوانین، مرتب کرنے چاہئیں، اس طرح غیر متعین رہنے دینے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔ اس سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو ملک کے تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر "کتاب وسنت" کے مطابق ہو۔ اور اس حقیقت کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ اتنا عرصہ گذر گیا، ملک کے لئے اس معیار کے مطابق کوئی ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکا ــــ نہ ہی ایسا ضابطہ اس وقت تک مرتب ہو سکتا ہے جب تک آپ سنت کا ایک متفق علیہ مفہوم متعین نہ کریں۔ اور یہ نہ طے کر لیں کہ یہ سنت آپ کو ملے گی کہاں سے۔ اوروں کو تو چھوڑیئے، آپ اسلامی مشاورتی کونسل کے ارکان سے کہئے کہ وہ

کسی ایسی کتاب کی نشاندہی کر دیں جو ان کے نزدیک متفق علیہ سنت کا مجموعہ ہو۔ کونسل کے ارکان کو بھی چھوڑیئے۔ اس کے چیئرمین سے کہئے کہ وہی کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کر دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ قیامت تک ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اب آپ سوچئے کہ جس کونسل کی اپنی یہ حالت ہو کہ اس نے اس بات کا ذمہ لے رکھا ہو کہ وہ بتائے گی کون سا قانون، کتاب و سنت کے خلاف ہے، لیکن ان کے ہاں یہی طے نہ ہو کہ متفق علیہ سنت کا مجموعہ کہاں سے ملے گا، وہ سفارشات کیا کرے گی اور اس کی سفارشات درخورِ اعتنا کس حد تک ہوں گی؟ دوسری طرف حکومت ہے جس نے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کونسل کی کون سی سفارش قابلِ قبول ہے اور کون سی مسترد کر دینے کے قابل — یہ فریضہ مرکزی حکومت کی وزارتِ قانون (منسٹری اوف لا) سے متعلق ہے۔ آپ مرکزی وزیرِ قانون سے گزارش کیجئے کہ وہی بتا دیں کہ آئین میں جو لکھا ہے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا تو اس میں سنت کا متعینہ مفہوم کیا ہے اور اس سنت کا مجموعہ جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو، کہاں سے ملے گا۔ اور اگر وہ یہ نہ بتا سکیں (اور وہ کبھی نہیں بتا سکیں گے) تو ان سے یاد دہانی کیجئے کہ جب آپ کے پاس کونسل کی کوئی سفارش آئے گی تو آپ کس معیار کے مطابق یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ "کتاب و سنت" کے مطابق ہے یا نہیں، جب آپ کے پاس "سنت" کا کوئی متفق علیہ مجموعہ ہی نہیں۔

۲۔ اب آئیے جرمِ زنا کی سزا کی طرف۔ یہ واضح ہے کہ صرف چند جرائم ایسے ہیں جن کی سزا بھی قرآن نے خود متعین کر دی ہے۔ ان میں ایک زنا ہے۔ اس کی سزا کے متعلق سورۃ نور میں ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۔ (۲۴/۲)

"زانیہ عورت اور زانی مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو"

اور سورۃ نساء میں ہے کہ لونڈی کی جرمِ زنا کی سزا، آزاد عورت سے نصف ہے (۴/۲۵) یعنی پچاس کوڑے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں اس جرم کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سزا بن بیاہی عورت اور کنوارے مرد کی ہے۔ شادی شدہ عورت اور مرد کی سزا رجم[1] یا سنگسار کرنا ہے۔ اس کی سند بڑی دلچسپ ہے۔ غور سے سنیئے:— موطا امام مالکؒ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے

---

[1] رجم کی سزا یہودیوں کے ہاں تھی۔

اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ کہ لوگو! اللہ تعالےٰ نے حضرت محمدؐ صلے اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جسے ہم نے تلاوت کیا، یاد بھی کیا، اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا۔ اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا[1] مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔" حدیث کی ایک دوسری کتاب (مسند امام احمد) میں اس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ

> اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا، عمرؓ نے لکھ دیا، تو میں آیۂ رجم کو اسی طرح لکھ دیتا جس طرح نازل ہوئی تھی۔

اب آپ یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ وہ آیہ رجم، جو قرآن میں موجود تھی جس کی صحابہؓ تلاوت کیا کرتے تھے۔ حفاظ نے جسے حفظ کیا تھا جس کے مطابق رسولؐ اللہ اور بعد کے زمانے میں عمل ہوتا رہا۔ وہ اُس قرآن میں نہیں تھی جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھا۔ (اور جو اِس قرآن میں بھی نہیں جو اِس وقت ہمارے پاس ہے) تو وہ آیت گئی کہاں؟ اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔ سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک کتاب ہے) حضرت عائشہؓ کی طرف یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ

> آیت رجم اور رضاعت کبیر (جس میں یہ کہا گیا تھا کہ دس گھونٹ دودھ پینے سے رضاعت کی حرمت ہو جاتی ہے) ایک صحیفے میں میرے تخت کے نیچے تھی، جب رسولؐ اللہ کا انتقال ہوا تو ہم لوگ اس حادثے میں مشغول ہو گئے اور گھر کی پالتو بکری آئی اور اس صحیفے کو کھا گئی۔

یوں آیہ رجم قرآن کریم میں نہ رہی۔ اور نہ ہی پھر بعد میں حضرت عمرؓ نے اسے قرآن میں درج کرنا مناسب سمجھا۔ البتہ اس کا حکم بدستور باقی رہا۔

(یعنے ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق، سینکڑوں آیات ایسی ہیں جو قرآن کریم میں موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اور ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم میں موجود نہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے۔)

---

[1] معلوم نہیں کہ لونڈیوں کے سلسلہ میں رجم کی نصف سزا کس طرح دی جاتی تھی؟

یہ ہے وہ سند جس کی رُو سے اسلام میں زنا کی سزا رجم بتائی جاتی ہے اور جس کی سفارش اب اسلامی مشاورتی کونسل نے کی ہے۔ آپ فرمائیے کہ یہ مقام کچھ لکھنے کا تھا یا سر پیٹ کر بیٹھ جانے کا؟ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ حکومت اس سفارش کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے؟ وہ اسے منظور کرتی ہے یا مسترد۔ اور اگر مسترد کرتی ہے تو کس دلیل اور سند کی بنا پر؟

۳۔ مذہب اور سیاست

سوال: علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"۔ لیکن سیکولرازم کے حامی کہتے ہیں کہ مذہب کا سیاست سے تعلق ہی کیا ہے کہ اس کے الگ ہونے سے سیاست چنگیزی بن جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص مندر میں جا کر ایشور کی بھگتی کر لے۔ دوسرا گرجے میں سرتین سن لے۔ تیسرا مسجد میں نماز پڑھ لے تو اس کا اثر ان کی سیاست پر کیا پڑے گا۔ اسکی وضاحت کر دیں کہ اقبالؒ نے کیا کہا ہے۔؟

جواب: آپ نے جو مثال دی ہے وہ "مذہب" کی ہے۔ اور مذہب کو سیاست سے الگ کر دینے سے سیاست پر واقعی کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ جیسا کہ آپ نے خود لکھا ہے مذہب اور سیاست کا کوئی جوڑ ہی نہیں۔ لیکن علامہ اقبالؒ نے جو کچھ کہا ہے (اور وہ عین قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہے) وہ یہ ہے کہ اگر دین کو (مذہب کو نہیں، دین کو) سیاست سے الگ کر دیا جائے تو سیاست، خالصتہً چنگیزی (یعنی دھاندلی کی) رہ جاتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ — لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا — هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵/۸) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو، ہمیشہ اور ہر حال میں ہر ایک کے ساتھ عدل کرو۔ یہ روش تقویٰ سے قریب تر ہے۔" یہ دین ہے اسے سیاست سے الگ کر دیجئے اور پھر دیکھئے کہ سیاست خالصتہً چنگیزی رہ جاتی ہے یا نہیں۔ دین نام ہے ان مستقل اقدارِ خداوندی کا جو احترامِ آدمیت کی بنیادوں پر قائم اور عدل و احسان کے اصولوں پر استوار ہیں۔ ان اقدار کو سیاست سے الگ کر لیجئے تو پھر وہ ابلیسی سیاست باقی رہ جاتی ہے جو آج کل ساری دنیا میں رائج ہے اور جس نے اس خطۂ ارضی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ سیکولرازم نام ہے سیاست کو ان اقدار سے الگ کر دینے کا۔ اور اس کی جیتی جاگتی مثال ہماری ہمسایہ قوم، ہندو کی سیکولر حکومت ہے۔

خورشید عالم

بھارت کا عالمی کردار ۳

یہ ایک قسط اور، پھر بھارت کا عنوان ختم ہو جائے گا۔ عنوان ختم ہو گا داستان ختم نہیں ہو گی۔ کم و بیش بارہ سو سال سے یہ داستان سنائی جا رہی ہے — اور جانے کب تک سنائی جاتی رہے گی — اب یہ پاکستان بلکہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد اجتماعی کا ایسا ناگزیر حصہ بن چکی ہے کہ عنوان کوئی ہو، داستان یہی ہو گی۔ اِس داستان کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہی ہمارے اور اسلام کے مستقبل کا دار و مدار ہے۔

آج ہم اس داستان کے اس حصے کو لیتے ہیں جو وسط اگست ۱۹۴۷ء سے شروع ہوا۔ آزادی نے برہمن کو عجب صورتِ حال سے دوچار کیا۔ یہ صورت اس کے لئے نئی تھی اور وہ غیر شعوری طور پر اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جیسا کہ پچھلی قسط میں واضح کیا جا چکا ہے، برہمن نے ورن آشرم کا جال اتنے جملہ طبقاتِ معاشرت کو ایسے جکڑ لیا تھا کہ سب اس کے خدمت گذار بن کے رہ گئے تھے۔ اس طرح برہمن خود اعلیٰ، ارفع اور مرکزی کردار تو بن گیا، لیکن کاروبارِ حکومت کو اس نے کبھی اپنا دردِ سر نہیں بننے دیا۔ وہ دنیاوی تفکرات و آلام سے آزاد اور انسانی اقدار و احساسات سے بے نیاز ہو کر اپنے ابلیسی کھیل میں لگا رہا۔ بادشاہ اس کے اشاروں پر ناچتے رہتے تھے۔ کشتری دشمنوں کے خلاف اس کا دفاع کرتے تھے، ویش اس کی خدمت بجا لاتے تھے۔ اور شودر نالی بن کر برہمن کے کرتوتوں کی آلائش لے جا جا کر ورن آشرم کے گندے جوہڑ میں پہنچا دیتے تھے۔

آزادی نے یہ سارا کھیل بگاڑ دیا، اور برہمن کو تخت پر بٹھا دیا۔ برہمن حکومت کا نہ اہل تھا، نہ اس کا خواہشمند۔ صدیوں سے اسے تازہ دم حکمران ملتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ہر نئے آنے والے کا سواگت کرتا تھا اور پرانے کی ہڈیاں چچوڑ کر ورن آشرم کے اندھے کنوئیں میں پھینک دیا کرتا تھا۔ اسے پہلے انوکھا تجربہ مسلمانوں کا ہوا۔ مسلمان حکمران رہے تو برہمن تعظیم کے سجدے بجا لاتا رہا۔ وہ زوال پذیر ہوتے تو برہمن انہیں اٹھا کر کوڑے

کے ڈھیر میں ملا کر ختم نہ کر سکا۔ مسلمان انگریز کے غلام بن گئے، مگر اپنا تشخص برقرار رکھنے پر مصر بھی رہے اور اس میں کامیاب بھی ہوتے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور کوئی ایک گروہ بھی برہمن کے چنگل سے بچ نہیں سکا تھا۔ یہ صرف مسلمان ہی تھے جنہیں برہمن ٹھکانے لگانے میں ناکام رہ گیا۔ اس کے لئے کوشش اس نے پہلے کی طرح ہی کی اپنی عادت کے مطابق برہمن نے اپنے آپ کو انگریز کے رنگ میں رنگنے اور ان سے ملی بھگت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ یہ مسلمان ہی ضرورت سے زیادہ سخت جان واقع ہوا تھا۔ برہمن اس کے بچ نکلنے پر ہی دانت پیس رہا تھا کہ مسلمان اپنی حکومت قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ اگر مسلمان اپنی جدوجہد سے صرف اپنی جداگانہ حکومت قائم کرتے تو شاید برہمن کے لئے وہ مشکل پیدا نہ ہوتی جو برصغیر کی تقسیم اور آزادی کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔ تنہا مسلمانوں کی آزادی کی صورت میں وہ یہ فرض کر لیتا کہ جیسے بودھوں نے برصغیر کی حدود سے باہر نکل کر اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں اسی طرح مسلمانوں کا کانٹا بھی اس کے پہلو سے نکل گیا ہے۔ یوں تو وہ انگریز سے اپنی عادتِ مستمرہ کے مطابق عہدہ برآ ہو لیتا یعنی اسے حکمران تسلیم کئے رکھتا تا آنکہ کوئی نیا تازہ دم حکمران گروہ آجاتا۔ پھر وہ معمول کے مطابق اسے حوالۂ شمشیر کرتا اور خود نئے آنے والے کے سامنے بچھ جاتا۔

ایسا نہیں ہوا۔ الٹا برہمن کو دوسرا انوکھا تجربہ ہوا۔ مسلمان کی جدوجہد سے پورا برصغیر آزاد ہو گیا۔ اور انگریز یہاں رہ کر وران آشرم میں ڈوب مرنے کی بجائے برہمن کو حکومت کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دینے پر مجبور ہو گیا۔ انگریز کے یوں چلے جانے سے برہمن نہ تو کسی نئے آنے والے کا انتظار کر سکتا تھا، اور نہ عہدِ حاضر کے تقاضوں کے پیشِ نظر کسی آنے والے کو بلا سکتا تھا۔ دنیا کو دکھانے کے لئے اسے آزادی کو قبول کرنا پڑا، لیکن صاف دکھائی دے رہا تھا کہ آزادی نے اسے کن پریشانیوں سے دوچار کر دیا ہے۔ اور اس کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہے۔ آزادی سے پانچ سال پہلے یعنی ۱۹۴۲ء میں، جب جنگ عظیم زوروں پر تھی اور انگریز کے برصغیر سے رضاکارانہ طور پر چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، برہمن نے بڑے دھڑلے سے یہ نعرہ لگایا تھا کہ برطانیہ کو برصغیر چھوڑ کے چلے جانا چاہیئے۔ کہنے کو وہ کہہ تو یہ رہا تھا کہ انگریز عنانِ حکومت اس کے ہاتھ میں دے اور بیک بینی و دو گوش نکل جائے لیکن وہ کہہ درحقیقت یہ رہا تھا کہ نیا آنے والا — جاپان — آرہا ہے لہٰذا انگریز کو اس کے لئے جگہ خالی کر دینی چاہیئے۔ اور اگر وہ از خود چلا نہیں جائے گا، تو برہمن اپنی عادت کے مطابق اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دے گا۔ اور اس کی لاش پر کھڑے ہو کر آنے والے کے سامنے سیس نوائے گا۔ برہمن جاپان کا سواگت کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ پنڈت نہرو کے منہ سے تو ایک بار یہ بھی نکل گیا تھا کہ بابو (گاندھی) یوں بات کر رہے ہیں گویا انہیں انگریز کی شکست کا یقین ہو گیا ہے۔ جاپان جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا تو ذہنیت کے اعتبار سے وہ برہمن گاندھی

بڑی ڈھٹائی سے انگریز کو یہ مشورہ دے چکے تھے کہ اسے ہٹلر کے سامنے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں اور برطانیہ کو جرمنی کے حوالے کردینا چاہیئے۔ جب جاپان کی آمد یقینی نظر آنے لگی تو برہمن کی روح کی گہرائیوں سے آواز اٹھی، کہ برطانیہ جاپان کے لئے جگہ خالی کردے۔ برہمن صدیوں سے اس کا عادی ہو چکا تھا کہ نیا آنے والا دروازے پر دستک دے رہا ہو تو پرانے سے نظریں پھیر لی جائیں۔

لیکن اتفاق کی بات، کہ آنے والا تو آ نہیں سکا، اور پرانا چھوڑ کے چلے جانے پر مجبور ہو گیا۔ آنکھیں پھیرنے اور رُخ بدلنے میں برہمن کو نہ کاوش کرنی پڑتی تھی، نہ ضمیر کی خلش محسوس ہوتی تھی۔ یہ قطعی حیران کن نہیں کہ ۱۹۴۲ء میں ہلڑبازی کرکے انگریز کو نکل جانے پر مجبور کرنے والے ۱۹۴۷ء میں اُسے روکے رکھنے کے لئے لاکھ فریب اور کروڑوں فسوں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جاپان آجاتا تو انگریز اس کے لئے بالکل بے مصرف ہو جاتا وہ نہیں آیا تو برہمن کو انگریز سے ہی کام چلانا پڑا۔ یہ بالکل اتفاقیہ امر نہیں کہ "آزاد" بھارت نے پہلا گورنر جنرل اپنے ہاں سے نہیں لیا بلکہ اس منصب کے لئے ایک انگریز ہی کو ترجیح دی۔ برہمنی ذہنیت کا یہ ادنیٰ کرشمہ تھا۔ یہ اس اذیت ناک کشمکش کا پرتو تھا جو برہمن کی رُوح کی گہرائیوں میں آزادی نے برپا کردی تھی۔ برہمن نے اس بہانے انگریز حکمران کو چندے اور روک لیا اور اپنی عادت کے عین مطابق اس سے مل کر پرانے حکمران یعنے مسلمان کے خلاف بھرپور سازش کی۔ اس طرح مسلمانوں کے ساتھ اس نے وہ کچھ کیا جو انگریز کے آنے پر وہ حسب عادت کرتا لیکن نہیں کرسکا تھا۔ اس نے پوری ڈھٹائی سے تلوار سونتی، اور بڑی بے دریغی سے چلائی۔ انگریز کے سائے میں اور اس کی مدد سے اپنے دیرینہ حریف یعنی مسلمان کو اپنے راستے سے ہٹانے کی اس نے بھرپور کوشش کی۔ آزادی کا کوئی تصور اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ کسی ایسے تصور کو ذہن میں جگہ دینے کے لئے تیار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ورن آشرم آزادی کے تصور کا کہاں متحمل ہو سکتا تھا۔ اس خیال کو دل میں راہ دینا ورن آشرم کے شجرِ خبیث کو بیخ و بُن سے اکھاڑ دینے کے سامان پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ برہمن نے روایتی عیاری سے دنیا کو دھوکا دینے کے لئے آزادی کی باتیں کیں، ورنہ آزادی سے پہلے وہ آزادی کا تصور کرسکا تھا تو صرف اس قدر کہ وہ اس قابل ہو جائے گا کہ جو کام وہ اٹھارہویں صدی میں انگریزوں کی آمد پر نہیں کرسکا تھا، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ وہ اپنے ذہن میں اسی تصورِ آزادی کو پرورش کرتا چلا آرہا تھا اور اسی کے لئے اس نے تیاری کر رکھی تھی۔ اگر ۱۹۴۷ء میں برہمن مسلمان کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کا آزادی کا مقصد پورا ہو جاتا۔ اور پھر وہ یہ سوچنے کے لئے بھی تیار نہ ہوتا کہ انگریز کو برصغیر سے نکل جانا چاہیئے، یا وہ نکل جاتے تو اس کی جگہ کوئی اور نہ لے لے، وہ انگریز سے تعرض اس وقت تک نہ کرتا جب تک کوئی نووارد اس کی جگہ لینے کے لئے آموجود نہ ہوتا۔

بہرکیف آزادی کے خطرے سے دوچار ہو کر برہمنی ذہنیت کا ایک مظاہرہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ انہیں بالکل یہی کچھ کرنا چاہئیے تھا کیونکہ برہمن یہی کچھ کرتا چلا آرہا تھا۔ اس ذہنیت کا دوسرا مظاہرہ یہ ہوا کہ برہمن نے انگریز سے ملی بھگت کر کے ہزاروں پاپڑ بیلے کہ مسلمان بے دست و پا ہو کر رہ جاتے۔ انگریز وائسرائے کو بھارت نے بڑی بے جملتی سے استعمال کیا۔ وائسرائے نے اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر راجاؤں اور نوابوں کو بھارت سے الحاق کرنے پر مجبور کیا۔ انگریز وائسرائے نے آزادی سے پہلے یہ مذموم کوشش کی کہ کشمیر کا مہاراجہ بھارت سے الحاق کرلے۔ انگریز وائسرائے نے ہی مغرور مہاراجے کا قانونی طور پر ناجائز اور اخلاقی طور پر بے جواز الحاق نامہ منظور کیا۔ انگریز ہی کی نگرانی میں اور انگریز جج ہی کی وساطت سے پاکستان کو ان مسلمان علاقوں سے محروم کیا گیا جو اصول تقسیم کے مطابق پاکستان کا جائز اور یقینی حصہ ہونے چاہئیں تھے۔ اسی سازش کے تحت بھارت کو کشمیر سے ملایا گیا، اور پاکستان کا حق غصب کر کے بھارت کو راستہ دیا گیا۔ اسی انگریز کے زور پر کشمیر میں بھارتی فوجیں بھجوائی گئیں اور اسی انگریز کی قیادت میں مجاہدین آزادی کے خلاف لڑائی گئیں۔ اسی انگریز سے سازش کر کے پاکستانی فوجوں کا کشمیر میں داخلہ روکا گیا، اور بھارت کی طرف سے بے تکلفی سے لڑنے والے اسی انگریز نے پاکستان کی طرف سے لڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی انگریز کے سائے میں جونا گڑھ، مانگرول اور مناوادر جیسے ان علاقوں پر چڑھائی کر کے قبضہ کر لیا گیا، جن کا قانونی طور پر پاکستان سے الحاق ہو چکا تھا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت میں آزادی کی پو نہیں پھٹی، آزادی کی چتا روشن ہوئی۔ ذرا غور کرنے سے برہمنی ذہنیت عریاں ہو کے سامنے آجاتی ہے۔ برہمن نے انگریز کو روکا اور اسے مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا۔ حصول آزادی اس کا مقصد ہوتا تو بھارت کا پہلا گورنر جنرل کبھی انگریز نہ ہوتا۔ برہمن اضطراری طور پر انگریز کو روک رہا تھا، اور پرانی اور غیر شعوری عادت کے مطابق اسے مسلمان کے خلاف استعمال کر رہا تھا۔ وہ انگریز کو روک سکتا تو روکے رکھتا اور کبھی نہ جانے دیتا۔ کیونکہ اسے انگریز سے استیصالِ مسلم کا کام لینا تھا۔ وہ اپنے آقا کو نہ جانے دینا چاہتا تھا۔ نہ اس نے جانے ہی دیا بدلے ہوئے حالات میں تو اس نے ایک آقا پر اکتفا کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ آزادی کا طوق گلے میں ڈال کر بھارت آقاؤں کی تلاش میں ملکوں ملکوں مارا مارا پھرتا رہا۔

اس کی خارجہ حکمت عملی کا نقطہ ماسکہ ہمیشہ یہی رہا کہ اسے غیر ملکی پاسبان میسر رہیں، تاکہ ان کے سہارے اور ان کی پشت پناہی میں وہ دیرینہ حریف یعنی مسلمان سے نپٹ سکے۔ اس نے ۱۹۵۱ء میں امریکہ سے حصولِ اسلحہ کا معاہدہ کیا، اور اس طرح امریکہ کو بھی برطانیہ کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کیا۔ بات

یہیں تک محدود نہیں رہی، ایک قدم آگے بڑھا کے اس نے غیر جانبداری کے لبادے کو برہمنی قامت پر درست کرنے کی کوشش شروع کر دی، تاکہ امریکہ کی ٹکر کی طاقت یعنے روس کی بھی اس پر التفات کی نظر ہو جائے، اور ان بڑی طاقتوں کی شہ پر اور ان کی مدد سے وہ دنیا بھر میں نہیں تو ایشیا میں ضرور برہمن بن کر بیٹھے اور دوسری ہمسایہ قومیں ویش اور شودر بن کر اس کی خدمت پر مامور ہوں۔ عالمی یا ایشیائی برہمن بننے کے لئے اس نے اپنی آزادی کا ذرہ بھر احترام نہیں کیا۔ آزادی کی متاع نہ اس کے بازار کی رونق تھی، نہ گھر کی زینت۔ یہ خالص سونا نہیں، سڑا ہوا تانبا تھا۔ چنانچہ قدم قدم پر وہ آزادی کے سودے کرتا رہا اور اس کے عوض میں وہی قیمت مانگتا رہا جو وہ صدیوں سے مانگتا اور بہت حد تک وصول کرتا چلا آرہا تھا، یعنی یہ کہ اس کی برہمنی اجارہ داریوں کو محفوظ رکھا جائے اور ورن آشرم کی انت اندھیری رات میں چراغ جلتا تو ایک طرف رہا، اسکے اندھے سینے سے روشنی کی ہلکی سی کرن بھی نہ پھوٹ سکے۔

اس کا بدترین مظاہرہ ۱۹۶۲ء کے آخر میں ہوا جب بھارت نے استعمارِ فرنگ کے اشارہ چشم و ابرو پر چین پر حملہ کر دینے کا بیک وقت احمقانہ اور خطرناک اقدام کیا۔ اگر چین غیر معمولی بردباری اور پیش بینی کا مظاہرہ نہ کرتا تو ہمالیہ کے بطن سے وہ لاوہ پھوٹ نکلتا کہ دنیا تیسری عالمگیر جنگ کی لپیٹ میں آکر جہنم زار بن جاتی۔ بھارت کو اس جگ پرلو کا کوئی فکر نہیں تھا۔ اُسے تو لنکا میں جلانے اور ڈھانے کے لئے ہنومان چاہئیں تھے۔ سو وہ ہاتھ لگ گئے۔ برطانیہ اور امریکہ یوں بھارت کے آنگن میں آدھمکے، جیسے یہ ان کا اپنا گھر ہو۔ انہوں نے اندھا دھند مدد پہنچائی، اور بالآخر بھارت کو امریکہ کے عالمی فوجی اڈوں سے یوں منسلک کر دیا کہ ضرورت کے وقت چشم زدن میں دُنیا کے کونے کونے سے ساز و سامانِ جنگ بھارت میں جھونکا جا سکے۔ امریکہ برہمن کا ایسا مزاج شناس نکلا، کہ اس نے بھارت کو ایٹمی چھتر تک مہیا کر دینے کی پیش کش کر دی۔ برہمن کی روح کے بس بھرے راگ کا یہی واحد جواب تھا۔ کتنا بڑا ہنومان قبضے میں آگیا تھا! وفورِ اضطراب میں برہمن اس کے چرنوں میں گر گیا۔ پرلے برہمن کی نئی جون، پنڈت نہرو، آزادی کی جان نذر کرنے کے لئے یہاں تک بیتاب ہوا کہ امریکہ نے ایک طاقت ور ٹرانسمیٹر اس شرط پر دینا منظور کیا کہ نقد قیمت لینے کی بجائے امریکہ ہر روز اُسے پروپیگنڈائی نشریات کے لئے استعمال کیا کرے گا۔ تو آنجناب نے اسے بلا حیل و حجت قبول کر لیا۔ حد تو یہ ہے کہ جب روس نے اس کے خلاف بجا طور پر احتجاج کیا تو اُسے جواب یہ دیا گیا کہ چین برہمن ہونے کی بجائے روس بھی انہی شرائط پر اپنا ٹرانسمیٹر لے کے آ جائے۔ قومی خودداری کی نفی میں اس درکِ اسفل تک پہنچ جانے والا ذہن وہی ہو سکتا ہے جس کی سیرابی کا فریضہ ورن آشرم کی تاریخی بدرو سرانجام دیتی رہی ہو۔

امریکہ اور روس کو کہ ان دو ہاتھیوں کے پاؤں میں سبھی پاؤں آجاتے تھے، اپنی کفالت سونپنے کے لئے بھارت نے عجیب حرکات کیں۔ یہ حرکات اضطراری بھی تھیں اور ارادی بھی ۔۔ برہمن کے اضطرار اور ارادے میں عملاً کوئی بُعد نہیں پایا جاتا۔ وہ سوچ کے وہی کچھ کرے گا جو بلا سوچے سمجھے اس سے سرزد ہوگا پنڈت نہرو ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو تعلیم اور تربیت کے لحاظ سے کشادہ نظر سمجھا جاتا تھا۔ ان کی اپنی تعلیم افقِ ذہن کو روشن اور بلند کرنے والی تھی۔ لیکن سیاست میں آکر اور حکومت کا سربراہ بن کر وہ قول اور فعل کے برہمن نکلے۔ ان کی تعلیم و تربیت کی گنگا ساری عمر برہمنیت ہی کے ساحلوں میں گھر کر بہتی رہی۔ برہمن کے ترازو میں آزادی اور کاسۂ گدائی میں کوئی فرق نہیں۔ خود کما کھانے کا نہ اُس نے کبھی سوچا، اور نہ سوچ ہی سکتا ہے۔ روس اور امریکہ کو دیکھ کر پنڈت نہرو کی برہمنی رگ پھڑکی اور اس نے ایک طرف جمہوریت کا راگ الاپنا شروع کر دیا اور دوسری طرف اشتراکیت کا۔ یہ دونوں اُن کے دکھانے کے دانت تھے اور انہیں انہوں نے خوب خوب دکھایا۔ شخصی اجاروں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انہوں نے قومی ملکیت اور معاشرتی انصاف کے تانے بنے۔ اور تنتے ہی گئے۔ اس تانے میں خلوص کا بانا ہو نہیں سکتا تھا۔ خود بھارتی اہل قلم اور اہل رائے تسلیم کرتے ہیں کہ ورن آشرم میں نہ جمہوریت کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ مساوات اور انصاف کا ۔۔ نفرت اور ناانصافی پر مبنی نظام میں ان انسانی اقدار کا کہاں گذر ہو سکتا ہے؟ جو معاشرت افقی اور عمودی طور پر منقسم ہو، اور جہاں تقسیم کی لکیروں کو دھرم کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، وہاں معاشرتی انصاف اور سیاسی مساوات کی کیا بات کی جا سکتی ہے؟ پنڈت نہرو کو اس سے سروکار نہیں تھا کہ بھارت کی زمین ان بیجوں کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور اگر یہ بیج بو بھی دیئے گئے، تو ذات پات کے گندے پانی سے ان کو پروان نہیں چڑھایا جا سکتا ۔۔ وہ تو درحقیقت جمہوریت کا نام لے کر امریکہ کو اپنے ہاں بلا رہے تھے۔ اور اشتراکیت کی بات کر کے رُوس کی راہ میں آنکھیں بچھا رہے تھے۔

برہمن کی اس دورُخی چال کے نتائج ابھی پوری طرح سامنے نہیں آئے۔ آثار و قرائن سے البتہ ان کی نشان دہی مشکل نہیں رہی جس جمہوریت کا بھارت دعویدار ہے، اس کی رُو سے جماعتی سیاست کا چلن ہونا چاہیئے۔ چلن بھی ایسا کہ آہستہ آہستہ دو سیاسی جماعتیں میدان میں رہ جائیں اور وہ ملک کو متبادل قیادت مہیا کرنے کی اہل ہوں۔ بھارت میں ایسا نہیں ہو سکا۔ پاکستان کی طرح بھارت کو بھی ایک سیاسی جماعت ورثے میں ملی۔ ایک سیاسی جماعت اس جمہوری نظام کو نہیں چلا سکتی جو بھارت بزعم خود چلا رہا ہے۔ اس نظام میں ایک جماعت گوناگوں مفاسد کی ذمہ دار بن جاتی ہے اور اقتدار کو معدودے چند ہاتھوں میں مرکوز کر دینے کا موجب ہوتی ہے۔ بھارت میں اٹھارہ سال تک اقتدار

صرف ایک شخص کے ہاتھ میں رہا۔ اس فردِ واحد نے اپنی شخصیت اور جماعت کو ایک ہی تصویر کے دو رُخ سمجھا اور سمجھایا۔ اس کی زندگی میں یہ حقیقت بالعموم نظروں سے اوجھل رہی کہ شخصیت کے بوجھ سے جماعت دم توڑ چکی ہے۔ یہ درست ہے کہ کانگرس کے سالانہ اجلاس کی رسم باقاعدگی سے ادا کی جاتی رہی، لیکن اس سے انکار ناممکن ہے کہ یہ تقریب نہرو کی رچائی ہوئی لیلا ہوتی تھی۔ جماعت نے نہ تو کوئی واضح منشور مرتب کیا، اور نہ ان بلند بانگ دعاوی کو لباسِ حقیقت پہنانے کی کوشش کی جو روس اور امریکہ پر نظریں جما کے دہرائے جاتے تھے۔ کانگریس یا بالفاظ دیگر نہرو کے منہ میں جمہوریت اور اشتراکیت ہؤا کرتی تھی اور بغل میں روس اور امریکہ ہؤا کرتے تھے۔ ان بیساکھیوں پر چل چل کے نہرو نے وقت گزارا، اور اپنے ملک کو ان ممالک کا ہم پلہ سمجھا اور خود کو اپنے ملک سے اونچا جانا۔ خود فریبی کے اس غبارے سے اب ہوا سرکنا شروع ہو گئی ہے۔

اس کا دوہرا نتیجہ نکل رہا ہے۔ ایک یہ کہ کانگریس بہ حیثیت جماعت ختم ہو چکی ہے۔ جسے اب کانگرس سمجھا جاتا ہے، وہ چند جنازہ بردوش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی فیصلے جماعتی سطح پر نہیں ہوتے۔ بلکہ شخصی طور پر ہوتے ہیں۔ اگر کانگرس حکومت سے آج بے دخل ہو جائے تو یہ ارتھی مرگھٹ تک بھی نہ پہنچ سکے۔ اسے اٹھائے پھرنے والے اسے پھینک کے یوں اپنی اپنی راہ لگ جائیں کہ انہیں دیکھ کے کوئی یہ خیال بھی نہ کر سکے کہ ان کے کندھے کس کام آتے رہے ہیں۔

اس صورت حال کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت نے اپنے ہاں آنے اور قابض ہونے کے لئے روس اور امریکہ میں مقابلہ شروع کرا دیا ہے۔ ایسا ہی ایک مقابلہ اس سے پہلے ہمالیہ کے اُس پار چین میں ہو چکا ہے (یہ اور بات ہے کہ وہ چین نے از خود نہیں کرایا تھا، بلکہ حالات کے تقاضے کے تحت شروع ہو گیا تھا)، چین میں برہمنیت نہیں تھی، اور وہاں روحِ انقلاب بھی بیدار ہو گئی تھی، اس لئے وہاں اس مقابلے میں سے انقلابی قیادت ابھر آئی، اور چین اس کی راہنمائی میں اپنے انتخاب کردہ راستے پر ہو لیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ بھارت میں اس مقابلے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس کے ہاں روس اور امریکہ اس طرح برسرِ پیکار نہیں ہیں جیسے وہ چین میں تھے۔ بھارت میں دونوں نہ تو ابھی تک پوری طرح ایک دوسرے کے حریف بن سکے ہیں۔ اور نہ معاون ــ پھر اس مقابلے میں چین اور روس اور چین اور بھارت کی کشمکش نے نئے عناصر کا اضافہ کر دیا ہے۔ اب ایک طرف روس، چین اور امریکہ، بھارت کے محاذ پر، باہم دست و گریباں ہیں اور دوسری طرف بھارت ان کے سائے میں اپنے آپ سے لڑ رہا ہے۔ یہ اندرونی لڑائی پیدا مسلمان کی آمد سے اسلام اور ورن آشرم کے ٹکراؤ سے ہوئی، اور اسے ہوا مل رہی ہے روس، چین اور امریکہ کے سہ گونہ

تصادم سے بھارت روحانی طور پر اذیت ناک دور سے گزر رہا ہے۔ چین کو تو امریکہ اور روس کے نظاموں میں سے ایک کو منتخب کرنا تھا۔ اس کا انتخاب واضح تھا۔ اس کے برعکس بھارت کے لئے مشکل اندر مشکل ہے۔ وہ خلوص دل سے کسی کے ساتھ نہیں۔ وہ برہمنی ذہنیت کے ہاتھوں مجبور ہے کہ کوئی ایک راہ اختیار کر کے اپنی مصیبت ختم نہ کرلے۔ وہ برہمنیت کو تیاگ نہیں سکتا اور برہمنیت زمانے کے ساتھ چل نہیں سکتی۔ جب تک وہ درنِ آشرم کے گندے جوہڑ کا مینڈک بنا رہے گا، اس کی مصیبت کبھی کم واقع نہیں ہوسکے گی۔ اس جوہڑ سے وہ بالآخر پاکستان کے ہاتھوں نکل سکے گا اور یہ مسئلہ پاکستان کی گہری توجہ کا مستحق ہے، کیونکہ اس کے بغیر پاکستان کا عالمی کردار نکھر کر سامنے نہیں آسکتا۔

طلوعِ اسلام کی کتابیں اور ماہنامہ طلوعِ اسلام یہاں سے بھی مل سکتی ہیں!

لاہور

۱۔ انٹرنیشنل بک سروس .. .. .. ۷۵ دی مال
۲۔ کلاسیک بک سیلرز .. .. .. ۴۲ دی مال
۳۔ پیپلز پبلشنگ ہاؤس .. .. ۲۶ دی مال
۴۔ کواپریٹو بک شاپ .. .. .. ۷۰ دی مال
۵۔ لاہور بک ڈپو .. .. .. ۷۵ دی مال
۶۔ بک سنٹر .. .. .. چوک ریگل دی مال
۷۔ ادبستان .. .. .. چوک لکشمی
۸۔ آئیڈیل بک ہاؤس .. .. ۱۹۴ - انارکلی
۹۔ مکتبۂ پاکستان .. .. چوک انارکلی
۱۰۔ گوشۂ ادب .. .. .. چوک انارکلی
۱۱۔ مرکزِ ادب .. .. .. چوک انارکلی
۱۲۔ نیشنل بک سٹال .. .. .. چوک انارکلی
۱۳۔ ماڈل بک سٹال .. .. ٹولنٹن مارکیٹ دی مال

ملتان۔ دانشکدہ — حسین آگاہی

لیہ

تھل ہوٹل نزد ریلوے سٹیشن ہر جمعہ کو بعد نماز عصر

انگلستان

محترم رشید احمد بٹ صاحب۔ ۱۲ سالٹ سٹریٹ بریڈفورڈ

کراچی

۱۔ محترم محمد اسلام صاحب ۴/۱۰۰۰۔ لوکیس روڈ نیو ٹاؤن کراچی
۲۔ ہر اتوار کی صبح سندھ اسمبلی ہال نزد سعید منزل۔ بندر روڈ۔
۳۔ گلڈز انجمن کتاب گھر۔ وکٹوریہ روڈ۔ صدر
۴۔ عوامی کتب خانہ — بولٹن مارکیٹ۔

لائلپور

۱۔ شریف سنز بک سیلرز۔ کارخانہ بازار
۲۔ محمد احمد صاحب منتظم ایم اے جی ٹی بلاک نزد پرانی غلہ منڈی ریل بازار۔
۳۔ حافظ محمد یونس صاحب۔ ۲۰۹-A۔ گلبرگ۔ لائلپور۔

سرگودھا۔ حکیم حسن محمد نظامی۔ نظامی دواخانہ بلاک ۳۔ گلی مچھلی والی۔ سرگودھا۔

حقائق و عبر

۱۔ بلا تبصرہ

ماہ نامہ الرحیم (حیدرآباد) کی اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت کے تشذرات میں لکھا ہے:۔

قاہرہ کے روزنامہ "الاہرام" میں اخوان المسلمین کے ان رہنماؤں کے مقدمے کی جو روئیداد چھپتی رہی ہے، وہ ہماری نظر سے گزری ہے۔ اس روئیداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان رہنماؤں پر جن الزامات کی بنا پر مقدمہ چلایا گیا تھا، وہ تمام تر سیاسی نوعیت کے تھے، اور دینی عقائد و اعمال سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ان الزامات میں غلط یا صحیح تشدد، اور مسلح قوت کے ذریعہ حکومت کا تختہ الٹنے کا بھی الزام تھا، اس ضمن میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ عدالت میں سید قطب مرحوم و مغفور کے سامنے جب ان کے وہ بیانات دہرائے گئے جن میں انہوں نے موجودہ نظام کو سزا سر جاہلی" قرار دیا ہے۔ اور اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کو ہی اس دور میں اسلام کا صحیح منصب و مقصد بتایا ہے تو ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے یہ خیالات کہاں سے اخذ کئے ہیں۔ اس سلسلے میں عدالت نے مولانا مودودی کا نام لیا اور کہا کہ کیا آپ نے موصوف کی کتابوں سے یہ خیالات لئے ہیں، تو سید قطب نے کہا کہ بے شک ایک حد تک۔

۲۔ سب جائز ہے!

ماہ نامہ "میثاق" (لاہور) کی اشاعت بابت اکتوبر، کے حصہ افکار و آراء میں تحریر ہے:۔

مجلس شوریٰ کے ایک بزرگ ترین رکن کا ایک بیان ہے جس سے مودودی صاحب کے قائم کردہ

کہ اس نظریۂ حکمتِ عملی کی حقیقت پر بڑی اچھی روشنی پڑ سکتی ہے کہ جب ملک میں مرزائیوں کے خلاف تحریکِ ختمِ نبوت کا آغاز ہوا، تو جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس تحریک میں عملاً کوئی حصہ نہ لے۔ لیکن جب جماعت کے حلقہ جاتی امراء کا اجتماع منعقد ہوا تو جماعت کے امیر جناب مودودی صاحب نے ان کو ہدایات دیں کہ اب جلتی بھی آگ بھڑکائی جا سکتی ہے بھڑکاؤ۔ اس پر ان بزرگ رکنِ شوریٰ نے اعتراض کیا کہ یہ ہدایات مجلسِ شوریٰ کے فیصلے کے قطعی خلاف ہیں، تو انہیں حکماً خاموش کر دیا گیا۔ اور پھر جب تحقیقاتی عدالت کے سامنے مودودی صاحب نے اپنا بیان دیا تو اس میں صاف طور پر یہ کہا گیا کہ جماعت نے عملاً اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ ہے نظریۂ حکمتِ عملی کی ایک عملی مثال، جس کے شاہد ایک سابق بزرگ ترین رکنِ شوریٰ ہیں۔

یہ ہے کردار ان لوگوں کا جو اسلامِ خالص کے علمبردار ہونے کے مدعی بنتے ہیں۔

۲۔ نذرِ نعیم صدیقی

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں محترم نعیم صدیقی (پبلسٹی سیکرٹری جماعتِ اسلامی) کا جو مقالہ درج کیا گیا تھا، اس کے اس ٹکڑے کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس میں کہا گیا تھا کہ

> میرا ایک سوال یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے اختلافات کو محبت بھرا، دلچسپ اور پیارا پیارا کھیل کیوں نہیں بنا سکتے؟ آخر افہام و تفہیم کے بجائے غیظ و غضب کیوں؟ بحث و نظر کے بجائے مجادلہ و مناظرہ کیوں؟ دلیل کے بجائے گالی کیوں؟ شریفانہ طرزِ گفتگو کے بجائے بازاری اندازِ بیان کیوں؟

نعیم صاحب کے اس سوال کے جواب میں ہم نے خود ان کے اور ان کی جماعت کے دیگر ذمہ دار افراد کے وہ کلماتِ شریفہ نقل کئے تھے جن میں وہی انداز اختیار کیا گیا تھا جس کے خلاف صدیقی صاحب صدائے احتجاج بلند فرما رہے تھے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے ماہنامہ میثاق (لاہور) کا اکتوبر ۷۶ء کا شمارہ آیا — یہ ماہنامہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی زیرِ سرپرستی اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے انہوں نے، اور جماعتِ اسلامی کے بہت سے دیگر ذمہ دار ارکان نے ۱۹۵۷ء میں، مودودی صاحب سے اختلافات کی بنا پر جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ان حضرات کے خلاف، اس جماعت کے افراد نے کیا روش اختیار کی تھی، اس کا ہلکا سا ذکر میثاق کی اس اشاعت میں کیا گیا ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

مشتے نمونہ از خروارے ۔۔۔ جماعت کے اہلِ قلم نے جماعت سے متعلق ایک ماہ نامے میں شرفو وغیرہ ۔۔۔ کے طنزیہ فقروں کے ساتھ ۔۔۔ ایک ڈرامے کی صورت میں جن کرداروں کا ذکر کیا تھا، غور فرمائیے کہ ان کا ہدف کون لوگ بنائے گئے تھے۔ یہ رویّہ تو پریس کے اندر تھا لیکن پرائیویٹ طور پر دھمکیوں اور مغلظات سے لبریز جو خطوط مولانا امین احسن صاحب اصلاحی وغیرہم کو موصول ہوتے رہے، ان کی داستان تو کہیں زیادہ تلخ و المناک ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب کو یہاں تک لکھا گیا کہ تم مولانا مودودی صاحب سے حسد کرتے ہو، اچھا ہم تمہیں اس حد تک جلائیں گے کہ اگر خدانخواستہ آج مودودی صاحب فوت ہو جائیں تو ہم ان کا ایک عالیشان مقبرہ کھڑا کریں گے تاکہ تم اسے دیکھ دیکھ کر اور جلتے رہو۔

حکیم اشرف صاحب کو ایک ضلع سے یہ تہدید آمیز خط ملا کہ اگر تم ہمارے علاقہ میں آ جاتے تو تمہیں قتل کر دیا جاتا۔

اسی پر بس نہیں کیا گیا، بلکہ مولانا اصلاحی صاحب کے مکان پر پہنچ کر ان سے رُو در رُو بدکلامیاں کی گئیں۔ ان تمام تحریری و تقریری کارگزاریوں کے مقابلے میں جماعت سے علیحدہ ہونے والوں کا صرف اتنا گناہ تھا کہ انہوں نے بعض گفتگوؤں میں مولانا مودودی صاحب کے موقف کی غلطیاں واضح کی تھیں۔ بعض نے اپنی علیحدگی کے وجوہ اختلافات پر مشتمل بیانات پریس میں دے دیئے اور بعض نے ان کے جدید غلط نظریات کا تحریری و تقریری ردّ کیا۔[1]

کیوں نعیم صاحب! کیا آپ کے دل میں اُس وقت بھی اس قسم کا درد اُٹھا تھا جب آپ کی جماعت کے افراد دوسروں کے خلاف یہ کچھ کہہ اور کر رہے تھے؟

۴۔ ہندو سیکولرازم میں مسلمانوں کی حالت

بھارت میں نئے انتخابات کے سلسلے میں زور شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی روش کیا

---

[1] یاد رہے کہ جماعت سے نکلنے والوں میں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نمایاں شخصیتوں میں سے تھے اور ڈرامے میں مذکور تعریفی ناموں کی زد کا دائرہ ان تک ممتد ہوتا تھا۔ (میثاق)

ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی فیکلٹی اوف سٹی تھیالوجی، کے ڈین، اور ماہنامہ برہان (دہلی) کے مدیر، سعید احمد صاحب اکبرآبادی، کا ایک مقالہ، اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۱ ستمبر کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ، ان مسلمانوں کو، جو پارلیمان میں بہ لحاظ تناسب آبادی، اپنی نشستیں حاصل کرنا چاہتے ہیں، مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

ہمارے سامنے کی بات ہے، آزادی کے بعد پہلے جنرل الیکشن کے موقع پر مرحوم رفیع احمد قدوائی کلکتہ آئے اور وہاں مسلمانوں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ انتخابات کیلئے کانگریس مسلمانوں کو تناسب آبادی کے لحاظ سے نامزدگی نہیں دے رہی ہے تو قدوائی صاحب نے بغیر کسی غصہ اور جھنجھلاہٹ کے بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ فرمایا۔ کہ تناسب آبادی کے لحاظ سے آپ نامزدگی کیوں چاہتے ہیں۔ اس لئے نا کہ یہ مسلمان پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں پہنچکر آپ کے حقوق کا تحفظ کریں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا تعلیم یافتہ طبقہ پاکستان کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ اب یہاں جو مسلمان رہ گئے ان میں کتنے ایسے ہیں جو پارلیمنٹ میں پہنچکر اپنی لیاقت و قابلیت سے دوسرے ممبروں کو متاثر کریں اور ان کو اپنا ہمنوا بنائیں۔ پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آج کانگرس کے ٹکٹ پر جو مسلمان منتخب ہو کر پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں پہنچیں گے اور جن پر آپ سب کو بھی اعتماد ہے وہ کل "ہر چہ دکانِ نمک رفت، نمک شد" کا (آپ لوگوں کے خیال میں) مصداق نہ ہو جائینگے۔ اور اگر بالفرض ایسا نہ بھی ہو، تو ایوان کے تمام ممبروں کے مقابلہ میں ان کی تعداد کتنی ہوگی؟ اور وہ اس تعداد کے بل بوتے پر کیا کر سکیں گے؟ ایک جمہوری نظام میں کوئی اقلیت، اکثریت کو اپنائے بغیر اپنے مسائل و معاملات کا حل پیدا کر ہی نہیں سکتی۔

قدوائی (مرحوم) کا یہ نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے بعد، سعید احمد صاحب مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ

اس الیکشن میں ان لوگوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے جنہوں نے سیکولرازم کو ایک عقیدہ کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے اور اس کو اپنی اصل شکل و صورت میں ملک میں برپا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

اس "سیکولرازم" نے وہاں مسلمانوں کی حالت کیا کر رکھی ہے اس کے متعلق ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے ناظم مولانا ابوالحسن ندوی صاحب، نے حال ہی میں "اپنے ایمانی بھائیوں، خصوصاً یو۔پی والوں کے نام" ایک اپیل شائع کی ہے جس میں سیکولر ہند کے تعلیمی نظام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

دل پر پتھر رکھ کر لیکن آنکھوں کی پٹی کھول کر یہ بات عرض کرنی پڑتی ہے کہ اب اس بات کے سمجھنے میں مطلق کسی دور بینی یا فراستِ ایمانی کی ضرورت نہیں کہ سرکاری اسکولوں میں (جن میں جبریہ تعلیم کے قانون کے ماتحت، نیز حالات و مصلحات کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنے بچوں کو تعلیم دلانا پڑے گا۔ اور کوئی آزاد متوازی نظام جو اس سے مستغنی کر سکے ایسے وسیع ملک میں ممکن العمل نہیں) جو نصاب بالخصوص ہندی اور سنسکرت میں پڑھایا جا رہا ہے اس کے بعد کسی مسلمان بچے کا کم سے کم معنے میں بھی مسلمان رہنا عقلاً اسی طرح ممکن نہیں جیسے دریا میں کودنے اور غوطہ لگانے کے بعد جسم کا خشک رہنا، اور دامن کا تر نہ ہونا، ممکن نہیں۔

اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ نصاب و نظام کے ذریعہ اس کا تو انتظام پورا کر دیا گیا ہے کہ مسلم و غیر مسلم کی اعتقادی تفریق اور شرک و توحید، پیغمبر و اوتار، عقیدۂ آخرت و عقیدۂ تناسخ وغیرہ کا باہمی فرق دس بیس سال کے عرصہ ہی میں مسلمان بچوں کے دل و دماغ میں باقی نہ رہے۔ اور جو کچھ آتے وہ دینِ حجازی اور ملتِ ابراہیمی کی تعلیم و تلقین نہ ہو بلکہ برہمنی تہذیب و فلسفہ کے اصول و تصورات ہوں اور ایک مسلمان بچہ صحیح معنی میں اور مذہبی حیثیت سے بھی اپنے ہندو ساتھی سے کہہ سکے ع

من تو شدم، تو من شدی ، من تن شدم، تو جاں شدی

یہ ہے اس ملک میں مسلمانوں کی حالت! جس سے الگ ہو کر اپنی آزاد مملکت قائم کرنے کی تحریک کی (جماعت اسلامی کی طرف سے) یہ کہہ کر مخالفت کی جاتی تھی کہ

جمہوریت کی بنا پر پاکستان میں جو حکومت قائم ہوگی، وہ ہندوستان کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہوگی۔

سوچئے، اور گہری فکر سے سوچئے کہ اگر ہم ہندوستان سے علیحدہ نہ ہوتے، یا (خدانکردہ، خدانکردہ) ہندو ہمارے اس خطۂ زمین پر پھر سے غلبہ حاصل کر لے تو اس کے بعد ہمارا حشر کیا ہوگا؟

طلوعِ اسلام

ہر خریدار کے نام چیک کر کے بھیجا جاتا ہے۔ لیکن اگر اسکے باوجود آپ کو پرچہ نہ ملے تو متعلقہ مہینہ کی پندرہ تاریخ تک اطلاع ملنے پر دوسرا پرچہ بلا قیمت بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ شکریہ! ناظم

رابطۂ باہمی

بزم لاہور

بزم کے نمائندہ، مرزا محمد خلیل صاحب کی عدم موجودگی میں، بزم، اپنے قائمقام نمائندہ شیخ سراج الحق صاحب کی زیر نگرانی، اسی ذوق و شوق اور جوش و خروش سے، اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں مصروفِ عمل ہے۔ ماہنامہ طلوع اسلام کی نشر و اشاعت، لٹریچر کی تقسیم، ہفتہ وار درس کا انتظام، ادارہ کا نظم و نسق ۔۔۔ یہ تمام کام نہایت حسنِ انتظام سے سرانجام پا رہے ہیں۔ درس میں اب ہم قرآن مجید کے آخری رُبع تک پہنچ گئے ہیں اور جو حقائق سامنے آ رہے ہیں، ان سے یہ حقیقت سمجھ میں آ رہی ہے کہ اس کتاب عظیم کی ترتیب بھی کس قدر معجزانہ ہے۔ درس میں سامعین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور شہر کے علاوہ مضافات کے حضرات بھی شرکت کرتے ہیں۔ خواتین خاص طور پر دلچسپی لیتی ہیں۔

بزم کراچی

یہ بزم اپنی کارکردگی کی رپورٹیں ماہانہ نہیں بلکہ ہفتہ وار بھیجتی ہے اور ہر ہفتے ایک نہ ایک نئی سرگرمی کی روئیداد سامنے آتی ہے۔ رسالہ طلوع اسلام اور لٹریچر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اس وقت بزم جو کچھ کر رہی ہے، اس کے علاوہ اب یہ پروگرام بھی اس کے زیر نظر ہے کہ درس گاہوں اور تعلیمی اداروں تک رسالہ کثیر تعداد میں پہنچا دیا جائے۔ نیز ہاکروں کے ذریعے تعلیم یافتہ گھروں تک بھی رسالہ بھیجا جائے۔ ہفتہ واری درس کا سلسلہ بڑی باقاعدگی اور سلیقہ سے جاری ہے۔ سامعین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ رسالہ کی عام اشاعت سے فضا میں قرآنی نظریات کا چرچا زیادہ ہو رہا ہے ۔۔۔ استفسارات کا سلسلہ بڑھ رہا ہے۔ زندگی کے عملی مسائل کا حل قرآن شریف کی روشنی میں تلاش کرنے کا جذبہ بیدار ہو رہا ہے۔ (اللہ تعالیٰ بزم کے جواں ہمت نمائندہ، **محمد اسلام**، اور ان کے پُرخلوص و باہمت رفقاء کے ارادوں میں برکت اور سعی و عمل کی استطاعت میں مزید اضافہ عطا کرے!)

بزمِ سرگودہا

بزم کے سابقہ نمائندہ، محترم شریف صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد، بزم کے تمام پروگرام حسبِ سابق پورے جذب و انہماک سے بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ درسِ قرآنِ کریم اب ۲۵ء نیو سول لائن میں باقاعدگی سے ہو رہا ہے۔ رسالہ کی اشاعت کا سلسلہ بڑھ رہا ہے۔

بزمِ لائل پور

لٹریچر کی نشر و اشاعت حسبِ سابق ہو رہی ہے۔ طلوعِ اسلام کے پرچے تعلیم یافتہ طبقہ تک پہنچائے جا رہے ہیں۔ درسِ قرآنِ مجید کا سلسلہ حسبِ معمول جاری ہے۔ انتظام کر لیا گیا ہے کہ ادارہ کی تصانیف خود بزم کے ہاں سے دستیاب ہو جایا کریں۔

بزمِ جلہ جیم۔ (ضلع ملتان)

اس نوزائیدہ بزم کے سامنے، مقدم کام ان غلط فہمیوں کا دور کرنا ہے جو قرآنی فکر کے مخالفین کی طرف سے، تحریکِ طلوعِ اسلام کے خلاف پھیلائی جاتی ہیں۔ اس کے لئے، لٹریچر کی تقسیم کے علاوہ، زبانی مذاکرات اور توضیحات بڑی مؤثر ثابت ہوئی ہیں۔ اب قرآنی فکر کے لئے فضا سازگار ہو رہی ہے لوگوں کی طرف سے لٹریچر کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ یہ تقاضا بھی ہو رہا ہے کہ پرویز صاحب کے درسِ قرآن کریم کا سلسلہ جلد از جلد شروع کیا جائے۔ یہ سوال بزم کے زیرِ غور ہے۔

بزمِ ملتان

درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ اب پہلے سے بھی زیادہ حسن و ذوق سے جاری ہے۔ سامعین کی دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ چونکہ بزم نے (مقامی حالات کے پیشِ نظر) درس کو فکرِ قرآنی کے عام کرنے کے لئے زیادہ مؤثر پایا ہے اس لئے وہ اسے فروغ دینے میں زیادہ کاوش سے کام لے رہی ہے۔ ویسے رسالہ طلوعِ اسلام کی اشاعت اور لٹریچر کی فراہمی کا سلسلہ بھی بدستور جاری ہے۔

بزمِ لیہ

درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے جس سے اس زمینِ شور میں بھی حیاتِ نو کی نمود شروع ہو گئی ہے۔ اعتراضات کم ہو رہے ہیں اور معلومات حاصل کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اس کے لئے ماہنامہ طلوعِ اسلام بڑا مفید کام کر رہا ہے۔ امید ہے اسکی اشاعت روز افزوں ترقی کرتی جائیگی۔

دیگر بزمیں

سابقہ کنونشن میں بزموں نے نشر و اشاعت کے سلسلہ میں جو جدید پروگرام اپنے سامنے رکھا تھا۔

مقام تشکر ہے کہ وہ پروگرام نہایت حسن و خوبی سے آگے بڑھ رہا ہے اور بزمیں نہایت خندہ پیشانی سے اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتے جارہی ہیں۔ اللہ ان سب کی ہمت میں برکت عطا فرمائے۔ تحریک طلوع اسلام میں چونکہ کام ہی کام کرنا ہے۔ اور اس کام کا کوئی معاوضہ دنیاوی مفاد و متاع یا منصب و مدارج کی شکل میں نہیں ملتا، اس لئے جو حضرات بھی اس بارگراں کو اٹھاتے ہیں اور اس میں کوئی ذاتی مقصد اپنے سامنے نہیں رکھتے، ان کی مساعی، ہمارے اندازوں سے بھی کہیں زیادہ ثمربار ہوتی ہیں۔ اور یہی ثمرات ہیں جو ہمارے لئے مزید ہمت افزائی کا موجب بنتے ہیں۔

نمائندگان کا اجتماع

سابقہ کنونشن میں طے پایا تھا کہ کنونشن کا آئندہ اجلاس اکتوبر۔ نومبر ۱۹۶۷ء میں منعقد کیا جائے، اور سب کنونشن کے لئے کسی مقام اور تاریخ کا تعین نہیں ہوا تھا۔ اب یہ تقاضا موصول ہو رہا ہے کہ (کم از کم) بزموں کے نمائندگان کا ایک اجلاس بلا تاخیر منعقد کیا جائے جس میں گزشتہ چھ سات ماہ کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے اور اس سلسلہ کو مزید ترقی دینے کے لئے تجاویز سوچی جائیں۔ یہ تجویز ادارہ کے زیر غور ہے فیصلہ سے بزموں کو بذریعہ خطوط اطلاع دی جائے گی۔

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

کراچی۔ سندھ اسمبلی ہال۔ نزد سعید منزل۔ بندر روڈ ہر اتوار کی صبح۔ ۹½ بجے

لاہور۔ ۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ ہر اتوار کی صبح ۹ بجے

ملتان۔ میسرز شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک گیٹ۔ ہر جمعہ بعد نماز مغرب۔

لائلپور۔ پنجاب ڈیریز۔ ۰۰۰۔ ایم۔ اے۔ پیپلز کالونی ہر جمعہ بعد نماز مغرب

راولپنڈی۔ الکوثر بلڈنگ متصل زنانہ کالج۔ مری روڈ ـــ ہر جمعہ شام ۴ بجے۔

سرگودہا۔ ۲۵۔ نیو سول لائن۔ کوارٹر ۲۔ ہر اتوار ۴ بجے شام

انگلستان۔ بزم طلوع اسلام۔ ۱۶۰۔ سالٹ سٹریٹ بریڈ فورڈ ۸ کے زیر اہتمام یہ درس ہر اتوار کی صبح دس بجے نشر ہوتا ہے۔ بریڈ فورڈ سے باہر رہنے والے احباب نمائندہ بزم کو مندرجہ بالا پتہ پر خط لکھ کر ٹیپ بھی منگا سکتے ہیں۔

لیہ۔ مقبل ہوٹل۔ نزد ریلوے اسٹیشن۔ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ۔

سید حسن۔ سید محمد حسین شاہ صاحب۔ نمائندہ بزم سے وقت اور مقام دریافت کر لیا جائے۔

وہ کتابیں جن سے اسلام کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند و منضبط اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری کا کام دیتی ہے [illegible] جلد اول [illegible] دوم [illegible] چوتھی جلد کی قیمت بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — [illegible] آٹھ روپے [illegible] پیپر ایڈیشن چار روپے۔

قرآنی فیصلے — [illegible] مسائل [illegible] معاشرہ کے [illegible] متعلق قرآن کریم کا [illegible]۔ بڑی ضخامت [illegible]

[illegible] جلد اول [illegible] روپے جلد دوم [illegible] روپے [illegible] جلد سوم [illegible] روپے۔

سلیم کے نام خطوط — [illegible] تعلیم یافتہ نوجوان کے دل میں [illegible] اسلام کے متعلق [illegible] پیدا ہوتے ہیں ان [illegible] کا [illegible] جواب [illegible] نوجوانوں کو [illegible] بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اول [illegible] روپے، جلد دوم [illegible] روپے، جلد سوم (چھ روپے)

انسان نے کیا سوچا — [illegible] اس وقت تک کے مختلف مفکرین [illegible] نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا [illegible] انسانی دنیا کی تحقیق [illegible] سینکڑوں کتابوں [illegible] قیمت دس روپے

نظامِ ربوبیت — انسانی زندگی [illegible] مسئلہ [illegible] نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل [illegible] قرآن [illegible] قرآنی کتاب (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کے تعلق [illegible] تصریحات [illegible] (دس روپے)

برقِ طور — [illegible] حضرت موسیٰ [illegible] بنی اسرائیل [illegible] فرعون و ہامان کی داستان [illegible]

داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — [illegible] داستان [illegible] آپ [illegible]

آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چار روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام / **ضحیٰ الاسلام** — مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی شہرۂ آفاق تصانیف کا اردو ترجمہ [illegible] قبل از اسلام [illegible] شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالمِ اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحیٰ الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق نابینا مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف [illegible]

[illegible] کے اسباب۔ [illegible] (چھ روپے)۔

Regd. L. No. 7243
MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

عربی خود سیکھئے

طلوع اسلام کی کوششوں کی بدولت قوم کے نوجوان طبقہ کے دل میں قرآن کریم کی طرف رجوع ہونے کا شوق پیدا ہوا تو یہ تقاضا بھی سامنے آیا کہ قرآن مجید کو خود سمجھنا چاہیے ۔ اس کے لیے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے ۔ ادارہ طلوع اسلام کی مدت سے خواہش تھی کہ ایک ایسی مختصر اور سلیس سی کتاب شائع کی جائے جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جائیں جس سے قرآن مجید بآسانی سمجھ میں آ جائے ۔ للہ الحمد کہ وہ کتاب اب شائع ہوگئی ہے ۔ اس کا نام ہے ۔

عربی خود سیکھئے

عام اشاعت کی غرض سے ایسے چیپ ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے ۔ قیمت فی جلد صرف اڑھائی روپے ۔ جلد منگا لیجئے ۔

ناظم ادراہ طلوع اسلام
۲۵/بی ۔ گلبرگ ، لاہور